حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری

فاتح قلوب

تحریر : ڈاکٹر ساجد امجد

اللہ کے تمام برگزیدہ بندوں کی خوبی یہ رہی ہے کہ انھوں نے کبھی کسی کو نہ دکھ پہنچایا نہ تکلیف دی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس لحاظ سے ایک انتہائی بلند مقام پر فائز ہوئے اور آپ کو خود لوگوں نے، جن میں اکثریت کفّار کی تھی، غریب نواز کا لقب دیا۔ آپ کو خواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ہندوستان کی ولایت بخشی اور اجمیر کو اپنا مُستقر بنانے کا حکم دیا۔ اُدھر ہندوستان کے مہاراجہ پرتھوی راج کے نجومی یہ پیش گوئی کرچکے تھے کہ دور دیس سے ایک دبلا پتلا، داڑھی والا، چوڑی پیشانی والا شخص آئے گا جس کے ہونٹوں پر مسکان ہوگی اور وہ پرتھوی راج کی سلطنت کو تباہ کردے گا اور پھر جب خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے چالیس ہمرائیوں کے ساتھ طویل فاصلے طے کرتے ہوئے اجمیر پہنچے تو نہ راستے میں اور نہ یہاں آپ کو کوئی روکنے والا تھا۔ صرف آپؒ کی زندگی ہی ہندوستان میں تبدیلیوں کا سبب نہ بنی، بلکہ آپ کی رحلت کے بعد بھی آپ کا مزار مرجعِ خلائق بنا ہوا ہے۔

''جس کو اللہ اپنی رضا مرحمت فرمادے وہ بہشت کو کیا سمجھے'' خواجہ غریب نوازؒ

دیواروں سے دھوپ اتری تو بچے گلی میں نکل آئے۔ تنگ گلی مزید تنگ ہوگئی لیکن اس طرح جیسے پھولوں کی کیاریاں صحنِ چمن کو آباد کردیں۔ یہ بچے مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر مختلف کھیلوں میں مشغول ہوگئے۔ ایک بچہ جوان سب سے چھوٹا بھی تھا، دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ اشتیاق تھا نہ حسرت۔ ہاں حیرت ضرور تھی۔

''معین الدینؒ! تم کیوں دور کھڑے ہو۔ آؤ تم بھی کھیلو۔'' ایک بچے نے قریب آکر کہا۔

''ہم کھیل کود کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔'' معین الدینؒ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''اگر بچے کھیلیں گے نہیں تو پھر اور کیا کریں گے۔''

''کھیل کے بجائے اپنا وقت اللہ کی عبادت میں گزارنا چاہئے۔''

یہ بچہ معین الدینؒ کی بات کو کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا لیکن قریب سے گزرنے والے ایک بزرگ کے قدموں نے چلنے سے انکار کردیا۔ وہ کچھ دور آگے بڑھے اور پھر لوٹ آئے۔

''بیٹے! کس خوش قسمت باپ کے بیٹے ہو؟''

''میرے والد گرامی کا نام خواجہ غیاث الدینؒ حسن ہے۔''

''اسی لیے تو اس عمر میں ایسی بزرگی کی باتیں کررہے ہو۔'' ان بزرگ نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے ایک اور صاحب کی توجہ اس جواب کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا ''یہ معمولی بچہ نہیں ہے۔ اپنے وقت پر بہت بڑے مقام پر فائز ہوگا۔''

تمام بچے پھر سے اپنے کھیل میں مشغول ہوگئے تھے۔ معین الدینؒ کچھ دیر انہیں کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر گھر کی طرف لوٹ گیا۔

☆☆☆

ظلم کے اندھیرے شہروں کی سرحدوں پر پہرا دے رہے تھے۔ خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا۔ اقتدار کے شکاری مصروفِ فساد تھے۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا، حیوانیت نے سر ابھارا تھا۔ انسانیت کونوں کھدروں میں دبکی ہوئی سسک رہی تھی۔ ڈاکو اور لٹیرے دندناتے پھر رہے تھے، راستے محفوظ تھے نہ گھروں میں عافیت تھی۔

حضرت غیاث الدینؒ حسن ابھی ابھی اصفہان سے تشریف لائے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ ماہ نور ان کے قریب آکر بیٹھ گئی تھیں کہ سفر کے حالات جان سکیں۔ قصبہ سنجر تک جو خبریں پہنچ رہی تھیں، وہ بہت وحشت ناک تھیں۔

"کہیے' حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں؟"
محترمہ ماہ نور نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن میں امید کے دریچوں کو بند ہوتے ہوئے دیکھ کر آیا ہوں۔ تجارتی شاہراہیں قطعی محفوظ نہیں ہیں۔ ہم تو خیر ایک چھوٹے سے قصبے میں ہیں لیکن بڑے شہروں کا برا حال ہے۔"

"ہم بھی محفوظ کب ہوئے۔ آپ کو تجارت کے لیے نیشاپور' اصفہان اور بغداد تک جانا پڑتا ہے۔"

"میں تو خیر احتیاط کرلوں گا۔ کچھ دن نہیں جاؤں گا۔ مجھے تو کچھ اور ہی فکر دامن گیر ہے۔"

"ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے پھر آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں؟"

"مجھے اپنی نہیں معین الدینؒ کی تعلیم کی فکر ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں اس کی تعلیم کیسے مکمل ہوگی۔ سنجر سے باہر کیسی کیسی علمی درس گاہیں ہیں لیکن حالات اجازت نہیں دیتے کہ وہ سنجر سے باہر جائے۔ خراسان پر فوج کشی ہو چکی ہے سیستان کا گورنر حراست میں آچکا ہے۔" "یہ حالات ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔"

"معین الدینؒ کی عمر ایک جگہ رکی تو نہیں رہے گی۔ اگر یہ عمر نکل گئی تو کیا ہوگا۔"

"آپ نے تو مجھے بھی فکر مند کر دیا۔ معین الدینؒ میں ابھی سے بزرگی کے آثار دیکھ رہی ہوں۔ اس میں عام بچوں جیسی کوئی بات نہیں۔ وہ پیدائشی ولی ہے۔ اسے تربیت کی سخت ضرورت ہے۔"

"اب یہ بیڑا مجھے خود اٹھانا پڑے گا یا پھر سنجر کے مکتب اس کی پناہ گاہ ہوں گے۔ اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔" حضرت غیاث الدینؒ نے کہا۔

☆☆☆

رات گزرتے گزرتے اپنے آخری کنارے پر آگئی تھی۔ ہر طرف سکوت تھا ویرانی تھی۔ سنجر کی گلیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مخلوقِ خدا نرم گرم بستروں میں محو استراحت تھی لیکن ایک گھر میں چراغ کی روشنی گھر کے مکینوں کی بیداری کا سراغ فراہم کر رہی تھی۔

دو مصلّے ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ ایک پر حضرت غیاث الدینؒ مصروفِ عبادت تھے دوسرے پر آپ کی اہلیہ محترمہ تہجد کے نوافل ادا فرما رہی تھیں۔ دونوں بابرکت نفوس برکتوں کے خزانے سمیٹ رہے تھے۔ وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ پھر اذانِ فجر کی آواز بلند ہوئی۔ حضرت غیاث الدینؒ نے سجدے سے سر اٹھایا۔

"اے اللہ! میرے معین الدینؒ کی تعلیم کا بندوبست فرما۔"

اب تھوڑی ہی دیر میں سیاہی میں سپیدی گھلنے والی تھی۔ حضرت غیاث الدینؒ نے نمازِ فجر کے لیے مسجد کا رخ کیا اور آپ کی اہلیہ محترمہ نے بچوں کو اٹھانا شروع کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائیں۔ کیسا بابرکت گھرانا تھا! اور کیوں نہ ہوتا۔ حضرت غیاث الدینؒ صحیح النسب سادات سے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت حسین ابن علیؓ سے ملتا تھا۔ صاحب حیثیت دولت مند تھے۔ علم و فضل میں درجۂ کمال حاصل تھا۔ اہلیہ محترمہ کی یہ شان کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی سگی چچی زاد ہیں۔ دونوں نفوس کی پاکیزگی نے گھر کو بابرکت بنا دیا تھا۔ عبادات میں اسی انہماک کا ثمر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولی کو اس گھر کے آنگن میں اتار دیا تھا۔

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

☆☆☆

ملکی حالات کی ابتری کا دائرہ پھیلتا ہی چلا گیا۔ مزید پانچ برس گزر گئے۔ معین الدینؒ حسن سنجری کی عمر دس سال ہوگئی تھی۔ فقہ حدیث اور تفسیر میں کسی حد تک دسترس بھی حاصل ہوگئی تھی کہ 544ھ میں ملکی حالات نے کچھ سنبھالا لیا۔ امن و امان کی حالت میں کچھ بہتری آگئی جس طرح شدید بارش کے بعد بادل چھٹ جائیں اور دھوپ جھانکنے لگے۔

حضرت غیاث الدین حسنؒ بہ سلسلہ تجارت نیشاپور جاتے رہتے تھے وہاں کے علمی ماحول سے واقف تھے۔ تمام دینی درس گاہیں ان کی دیکھی بھالی تھیں۔ علما سے متعارف بھی تھے اور وہ ان کی عظمت کے معترف بھی تھے۔ خوابوں نے آنکھوں میں گھر بنا لیا۔ وہ عالم تصور میں اپنے لختِ جگر کو نیشاپور کی ایک عظیم درسگاہ میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

شعلوں کی لپک میں کمی آگئی تھی' اڑتی ہوئی گرد بیٹھ گئی تھی۔ راستے محفوظ ہوگئے تھے خوارزمی اور غزنوی سلطنتیں وجود میں آچکی تھیں۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے خیالات کو عملی جامعہ پہناتے۔ انہوں نے بیوی سے مشورہ کیا۔ جدائی کی خبر ناقابل برداشت تھی لیکن شوہر کی رضا اور بیٹے کا مستقبل سامنے تھا۔ انہوں نے بھی دل پر پتھر رکھ کر اجازت دے دی۔ گھر کا چراغ گھر سے رخصت ہو رہا تھا لیکن یہ یقین بھی تھا کہ جب لوٹ کر آئے گا تو چاند سے زیادہ روشن ہوگا۔

سواری کا گھوڑا دروازے پر بندھا تھا۔ بی بی ماہ نور نے لختِ جگر کو سینے سے لگایا۔ دعاؤں کے تحفے ساتھ کئے۔ حضرت

غیاث الدینؒ نے رکاب میں پاؤں ڈالا اور سوار ہو گئے۔ دس سالہ معین الدینؒ نے ایک ہاتھ سے باپ کا ہاتھ تھاما' دوسری طرف سے ماں نے سہارا دیا۔ وہ گھوڑے پر باپ کے پیچھے بیٹھ گئے۔

حضرت غیاث الدینؒ متعدد بار نیشا پور کا سفر کر چکے تھے۔ تمام راستے دیکھے بھالے تھے لیکن اس وقت وہ بہت محتاط تھے۔ ان کی زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ معین الدینؒ کی صورت میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ بار بار ادھر ادھر دیکھ لیتے کہ کوئی لٹیرا گھات میں نہ بیٹھا ہو۔ گھوڑا کبھی سرپٹ دوڑنے لگتا' کبھی وہ راسیں کھینچ لیتے کہ معین الدینؒ کو جھٹکے نہ لگیں۔

''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''

دروازۂ شہر نزدیک آ رہا تھا۔ چہل پہل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اسباب سے لدے ہوئے خچر شہر میں داخل ہو رہے تھے یا شہر سے باہر نکل رہے تھے۔ حضرت معین الدینؒ کے لیے یہ مناظر تماشے سے کم نہیں تھے۔ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو یہاں کی بھیڑ بھاڑ نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے قصبے سے آئے تھے۔ سنجر کے مقابلے میں نیشا پور کی شان ہی دوسری تھی۔ سامان سے بھری ہوئی دکانیں' خریداروں کا ہجوم' بازاروں کی بھیڑ بھاڑ ان کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ گھوڑے سے نیچے اتر کر ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے لیکن اس وقت تو انہیں کسی عظیم درس گاہ تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ شہر کی آبادی کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کی درس گاہیں بھی لاجواب ہوں گی۔

حضرت غیاث الدینؒ کے لیے نہ یہ شہر نیا تھا نہ راستے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں کون کون سی درس گاہیں ہیں اور انہیں کہاں جانا ہے۔ ایک درس گاہ کے سامنے پہنچ کر وہ گھوڑے سے نیچے اتر گئے، دونوں ہاتھ پھیلائے تو ماہِ سنجر معین الدینؒ ان کی آغوش میں تھا۔ معین الدینؒ نے اس مدرسے کے در و دیوار پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ یہ وہ دیواریں تھیں جن کے عقب میں دنیا کے مایہ ناز اساتذہ علمِ دین پڑھانے اور بہترین افراد پڑھنے میں مشغول تھے۔

حضرت غیاث الدینؒ نے بیٹے کا ہاتھ تھاما اور مدرسے میں داخل ہو گئے۔ غیاث الدینؒ کوئی عام بزرگ نہیں تھے۔ علم و فضل میں یکتا اور باطنی علوم سے آراستہ تھے۔ علمائے وقت ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اس مدرسہ میں بھی کئی علما ان کے پرستار تھے۔ انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور معین الدینؒ کا ہاتھ ان اساتذہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

سوانحی خاکہ

نام:	حضرت خواجہ معین الدینؒ
والد:	حضرت خواجہ غیاث الدینؒ
والدہ:	بی بی ام الورع الموسوم ماہ نور
بھائی' بہن:	دو بھائی' ایک بہن
مرشد:	حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ
سن پیدائش:	535ھ
اجمیر آمد:	587ھ
پہلی شادی:	598ھ
دوسری شادی:	616ھ
زوجۂ اول:	حضرت بی بی امۃ اللہ
زوجۂ دوم:	حضرت بی بی عصمت اللہ
بیٹے:	خواجہ فخر الدین ابوالخیرؒ
	حضرت حسام الدین ابوصالحؒ
	حضرت خواجہ ضیاالدین ابوسعیدؒ
بیٹی:	بی بی حافظہ جمال
تاریخ وفات:	634ھ
مزارِ شریف:	اجمیر' ہندوستان

حضرت غیاث الدینؒ نے اپنے بیٹے کے لیے قیام کا بندوبست کیا۔ کچھ روز نیشا پور میں قیام کیا اور پھر خوشی خوشی سنجر کی طرف واپس پلٹ گئے۔ گھر پہنچے تو اہلیہ کو سراپا انتظار دیکھا۔ وہ یہ سننے کے لیے بے چین تھیں کہ ان کا بیٹا خیریت سے نیشا پور پہنچ گیا۔ خیریت کی خبر سنی تو دل سے خلش دور ہوئی۔ اسی وقت شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے مصلّے پر کھڑی ہو گئیں۔ ''اے اللہ! میرے معین کے قلب و ذہن کو کھول دے۔''

نیشا پور کون سا دور تھا۔ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ حضرت غیاث الدینؒ کو جب فرصت ملتی بیٹے کو دیکھنے نیشا پور پہنچ جاتے کچھ دن قیام کرتے اور پھر سنجر چلے آتے۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ ان کا ہونہار فرزند بڑے انہماک سے حصولِ علم میں مشغول ہے۔ درس گاہ میں اس کی ذہانت اور سعادت مندی کا چرچا ہے۔ اساتذہ تک اس قابل شاگرد کی تکریم کرتے ہیں۔

وقت کچھ دیر کے لیے ٹھہر سا گیا تھا۔ اطمینان و عافیت

نے طنابیں چھوڑیں تو ساعتیں فراٹے بھرنے لگیں یہاں تک کہ چار سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ معین الدینؒ ابھی نیشا پور میں علوم دین کی بہاریں لوٹ رہے تھے کہ حضرت غیاث الدینؒ نے تجارت کی غرض سے کچھ دن بغداد میں قیام کا ارادہ کیا۔ وہ بغداد پہنچے ہی تھے کہ ہوا بدلنے لگی۔ غزنیوں نے جنگِ بلخ میں سلطان سنجر کو گرفتار کرلیا اور پھر نیشا پور پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ پہلے افواہوں کے لشکر شہر میں داخل ہوئے پھر سچ مچ کے سپاہی آگئے۔ موت کے عفریت تلواریں ہاتھوں میں لیے نہتے شہریوں پر ٹوٹ پڑے۔ جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ چلو مسجد تبعی میں پناہ لیتے ہیں۔ حملہ آور مسلمان ہیں' مسجد کا رخ نہیں کریں گے۔

حضرت معین الدینؒ کئی دن اپنی قیام گاہ کو پناہ گاہ بنا کر چھپے رہے۔ آخر ایک روز چھپتے چھپاتے باہر نکلے۔ یہ وہ شہر ہی نہیں تھا جہاں وہ آئے تھے۔ ہر طرف سکون تھا جیسے یہ شہر نہ ہو قبرستان ہو۔ بچے' عورتیں' بوڑھے اپنے ہی خون میں نہائے سڑکوں پر پڑے تھے۔

پندرہ سال کا ایک لڑکا سڑک پر بے تحاشا دوڑنے لگا۔ اسے اپنی درس گاہ کی یاد آگئی تھی۔ مادرِ علمی پر کیا گزری؟ اس کے قدم ایک جگہ رک گئے۔ یہی تو وہ درس گاہ ہے جہاں وہ علم حاصل کرنے آیا تھا۔ یہاں اب رکھا ہی کیا تھا۔ اس نے اپنے کئی ساتھیوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی دیکھیں۔ اس کا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکلنے کو تھا۔ اب وہ یہاں رک کر کیا کرتا۔ اسے چلنے کی جلدی تھی مگر بھاگنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شہر سے باہر نکل گیا۔ حدِ نگاہ تک طویل راستہ تھا۔ کوئی بستی نہ آبادی نہ سواری۔ کئی میل چلنے کے بعد پیاس نے ستایا لیکن پانی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ اگر تلواروں نے مجھے چھوڑ دیا تو کیا' بھوک اور پیاس مجھے نہیں چھوڑے گی۔ کبھی رکتے کبھی چلتے۔ آخر کئی دنوں کے تکلیف دہ سفر کے بعد بھوکے' پیاسے نڈھال سنجر پہنچ گئے اور ماں کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ تھکن تھی کہ منڈیر کی دھوپ کی طرح اتر گئی۔ اپنے چاند کو گہنائے ہوئے دیکھا تو والدہ پانی کے لیے دوڑیں۔

''میرے بچے! کیا حال ہو گیا تیرا۔''

''آپ کی دعاؤں سے زندہ رہ گیا ورنہ جہاں میں تھا وہاں شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو۔''

''انسانیت کی اس تذلیل کو بھولنا مت۔'' ماں نے کہا اور اپنے آنچل سے اس کے چہرے کی گرد صاف کرنے لگیں۔

ماں کو تو انہیں زندہ دیکھ کر ان کی سلامتی کا یقین ہو گیا تھا لیکن نیشا پور کے قتلِ عام کی خبر جب بغداد پہنچی تو حضرت غیاث الدینؒ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ صاحب فراش ہو گئے۔ پردیس میں بیٹے کی موت کا جب بھی خیال آتا' آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے' خیال تھا کہ امن ہوتے ہی بیٹے کی تلاش میں نکلیں گے لیکن انتظار کی تاب ہی کب تھی۔ بیٹے کی محبت میں اپنی جان خالق حقیقی کو سونپ دی۔

اہلِ بغداد کے دل ان کی عظمت و بزرگی سے آباد تھے۔ ان کی موت کا علم ہوا تو عقیدت مند جمع ہو گئے اور پھر بغداد میں ہی دروازۂ شام کے قریب سپردِ خاک کر دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا مزار مرجع خلائق بن گیا۔

والد گرامی کی وفات کی خبر سنجر پہنچی تو آپ کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ممکن تھا کہ اس صدمے سے وہ بکھر کر رہ جاتے لیکن صبر و رضا کی پیکر والدہ محترمہ نے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا' بکھرنے نہ دیا۔ ''جب ایسا وقت آئے تو اللہ کو یاد کرو۔''

بی بی ماہ نور کثرت سے عبادت فرماتی تھیں۔ اپنے عہد کی رابعہ بصری تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد ان کی عبادت میں مزید خلوص آگیا۔ حضرت معین الدینؒ کو بھی اب والدہ کی خدمت اور عبادت و ریاضت کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

بی بی ماہ نور نے شوہر کی وفات کے بعد ساری توجہ اپنے بچوں پر مرکوز کر دی تھی۔ خصوصاً معین الدینؒ سے انہیں بڑی امیدیں تھیں' البتہ انہیں اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے تیور بدلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ وہ کئی دن سے محسوس کر رہی تھیں۔ حضرت معین الدینؒ کے بڑے بھائیوں نے والد گرامی کے ورثے کی تقسیم کا تقاضا کر دیا۔

''اماں جان! والد گرامی کے وصال کو اب بہت دن ہو گئے ان کی جائیداد میں جو حصہ ہمارا بنتا ہے وہ اب ہمیں ملنا چاہیے۔''

''جو کچھ ہے وہ تم سب ہی کا تو ہے پھر اسے الگ الگ کرنے کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟'' بی بی ماہ نور نے کہا۔

''ایک چیز سب کی ہو تو جھگڑے کا امکان رہتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا کیا ہے اور معین الدینؒ کا کیا ہے۔''

''اس کی طرف سے تو کوئی مطالبہ نہیں آیا اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ اس تقسیم کے حق میں ہو گا بھی نہیں۔''

''وہ نہ چاہے مگر اس کا حق بھی اسے ملنا چاہیے۔''

جب بیٹوں کی طرف سے اصرار بڑھنے لگا تو بی بی ماہ نور

نے ترکہ تمام بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں ایک وسیع باغ اور پن چکی خواجہ معین الدینؒ کے حصے میں آئی۔

بھائیوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا لیکن اس تقسیم نے حضرت معین الدینؒ کو افسردہ کر دیا۔ ایک تو یہ صدمہ دامن گیر تھا کہ والد گرامی کی جائیداد کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی دوسرے یہ فکر تھی کہ اپنے حصے کی جائیداد کی دیکھ بھال میں وقت صرف کرنا پڑے گا۔ وہ تو یہ طے کر چکے تھے کہ اب اپنا تمام وقت یادِ الٰہی میں گزاریں گے لیکن اب اپنی اور ماں کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے باغ کی نگرانی اور کاشتکاری کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا۔ ہاتھ کام میں لگے رہتے اور دل یادِ الٰہی میں مشغول رہتا۔ انہوں نے اس دنیاداری کو بھی عبادت میں بدل دیا۔

یہ وقت نہایت آرام وسکون سے گزر رہا تھا کہ آزمائش کی گھڑی نے آواز دی۔ ایک دن تھکے ہارے باغ سے واپس آئے تو والدہ کی طبیعت کو ناساز دیکھا۔ ایک یہی ہستی تو تھی جس کی وجہ سے دنیا انہیں اچھی لگتی تھی۔ ماں کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ علاج معالجے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ دعاؤں کے عریضے بھی دربار الٰہی میں روانہ کئے لیکن مشیت ایزدی کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔ تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ والدہ محترمہ چند روز صاحبِ فراش رہنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ والدہ کی تربیت یہی تھی کہ مصائب کے روبرو بھی صبر وشکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ آپ نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور اللہ کی رضا کو اپنی رضا بنا کر سر جھکا لیا۔

ایک دن حسبِ معمول باغ کی خدمت میں مصروف تھے۔ ہاتھ کام میں، دل یادالٰہی میں مشغول تھا کہ سوکھے پتوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ابراہیم قندوزی اور اس باغ میں! مجذوبیت کے رنگ میں روحانیت کے ایسے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ پیران پیر حضرت غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ نے آپ کے ساتھ ایک شب گزارنے کی آرزو کی تھی اور بہ صد مشکل یہ آرزو پوری ہوئی تھی۔ اللہ اللہ میری قسمت کہ آرزو کئے بغیر یہ نعمت مجھے مل گئی۔ آپ پیشوائی کے لیے آگے بڑھے۔ نہایت ادب سے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور ایک گھنے درخت کے نیچے چادر بچھادی۔

''حضرت تشریف رکھیں۔'' آپ نے کہا اور دوڑ کر ایک کٹورے میں پانی لے آئے۔ پھر دوسری طرف بھاگے اور انگور کا ایک خوشہ توڑ کر لے آئے۔ نہایت ادب سے دونوں

''خطابات''

1۔ قطب المشائخ برّ و بحر۔ 2۔ خواجۂ اجمیر۔ 3۔ ہند النبی 4۔ عطائے رسولؐ۔ 5۔ خواجۂ بزرگ۔ 6۔ ہندالولی۔ 7۔ غریب نواز۔ 8۔ سلطانِ الہند۔ 9۔ نائبِ رسول فی الہند۔

ہاتھوں کا پیالہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت ابراہیم قندوزی کی نظریں ان کی پیشانی پر جمی ہوئی تھیں جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ پھر اس خوشے سے ایک دانہ انگور کا توڑ لیا۔

''لو اب ہم تمہیں کچھ کھلاتے ہیں۔'' حضرت ابراہیم قندوزی نے فرمایا۔

انہوں نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کھلی کا ایک ٹکڑا نکالا اور اپنے دانتوں سے چبانے لگے۔ خواجہ معین الدینؒ بڑی محویت سے دیکھ رہے تھے۔

جب ابراہیم قندوزی اس کھلی کا ٹکڑا اچھی طرح چبا چکے تو اس ٹکڑے کو دہن مبارک سے نکال کر حضرت معین الدینؒ کے دہن میں رکھ دیا۔

اس ٹکڑے کا حلق سے اترنا تھا کہ دنیا ہی بدل گئی۔ حجابات اٹھ گئے۔ انوارالٰہی کی ایسی بارش ہوئی کہ آنکھیں کچھ اور دیکھنا بھول گئیں۔ پھر نہ باغ تھا نہ اپنے ہونے کا احساس۔ کوئی اور ہی دنیا تھی جس کی سیر کو وہ نکلے ہوئے تھے۔ گردوپیش کا ہوش نہ تھا۔

نہ جانے یہ کیفیت کب تک برقرار رہی۔ جب آپ اس کیفیت سے باہر آئے تو کٹورے میں تھوڑا سا پانی تھا۔ چادر پر انگور کا خوشہ رکھا ہوا تھا لیکن ابراہیم قندوزی موجود نہیں تھے۔ آپ بے تحاشا باغ کے دروازے کی طرف بھاگے۔ جانے والے کے قدموں کے نشان تک نہیں تھے۔ باغ میں آکر ڈھونڈا۔ ایک ایک درخت کے پیچھے جھانکا، کچھ نظر نہ آیا۔ تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گئے۔

ایک شخص کیا گیا' دنیا ہی خالی ہو گئی۔ جب وہ نہیں تو کیسا باغ کہاں کے انگور۔ میں کیوں سنجر کیا۔ آپ عالمِ مستی میں اٹھے اور اپنے باغ اور پن چکی کا سودا کر دیا۔ اس سے جو رقم ملی فقرا اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر کے سنجر سے نکل گئے۔ انہیں خود بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے اور کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ بس چلتے ہی رہنا ہے' یہ کون سا راستہ ہے کہ نہ

آبادی نہ بستی' ندیاں ہیں نالے اور ریت کے ٹیلے ہیں۔ جنگل ہے اور جنگل کے درندے۔

کافی دنوں کی مسافت کے بعد دور کسی شہر کی دیواریں نظر آئیں۔ قدموں میں تیزی آگئی۔ سامنے شہر کا دروازہ تھا۔ یہ شہر تو ہے مگر کون سا؟ کوئی باہر نکلے تو پوچھوں۔ آخر ایک شخص باہر آیا۔

''بھائی' یہ کون سا شہر ہے؟''

''بخارا'' اس آدمی نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

آپ نے ذرا غور کیا تو حافظے کے دفتر میں اس نام کو کئی جگہ لکھا ہوا دیکھا۔ والد گرامی سے کئی مرتبہ اس شہر کے بارے میں سن چکے تھے کہ یہ شہر خانقاہوں اور مدرسوں کی جنت ہے۔ ہزاروں تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے یہاں آتے تھے۔ تو کیا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی مشیت ہے اس نے مجھے اس راستے پر ڈال دیا جو بخارا تک آتا تھا؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ نیشاپور میں خون ریزی کی بدولت میری تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے میں اپنی تعلیم مکمل کروں۔ آپ نے سوچا اور دروازۂ شہر میں قدم رکھ دیا۔

اس شہر کے بارے میں جیسا سنا تھا اسے ویسا ہی پایا۔ شہریوں کے چہروں پر علم کی روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کئی دیواروں پر مکتب ہونے کا گمان ہوا۔ کون سا دریا پایاب ہے کون سا تایاب' یہ کس سے پوچھا جائے' ہر طرف موتیوں کے خزانے ہیں۔ کس موتی کا انتخاب کیا جائے' یہ کون بتائے؟

''بھائی' یہاں سب سے مشہور و معروف شخص کون ہے؟'' انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔

''تم تاجر ہو یا طالبِ علم؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''میں نے تو طالبِ علم کے لیے سفر اختیار کیا ہے۔''

''تو پھر شیخ حسام الدینؒ کی خدمت میں وقت گزارو۔''

شیخ حسام الدین کے مکتب کا پتا معلوم کرنا کون سا دشوار تھا۔ ایک راہ گیر نے خود رہنمائی کی اور انہیں شیخ حسام الدینؒ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ انہوں نے آپ کے حالات سنے' راہ کی تکلیفوں کا احوال سنا تو طلبِ صادق کا یقین آگیا۔ خواجہ معین الدینؒ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''سر اٹھاؤ' میں دیکھ رہا ہوں یہ سر کسی غیر اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں بنا۔ علم کی طلب میں نکلے ہو تو دامن پھیلاؤ جو کچھ حاصل کر سکتے ہو کر لو۔''

وہ تو گھر بار کو خیر باد کہہ کر نکلے ہی اسی مقصد سے تھے۔ ذوق و شوق سے علم کے حصول میں منہمک ہو گئے۔ آپ کے خلوصِ دل نے یہاں بھی رنگ دکھایا۔ جلد ہی اساتذہ کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ منزلوں پر منزلیں سر کرتے رہے۔ راتیں عبادت میں اور دن مطالعے میں بسر ہونے لگے۔ طالب علم انہیں رشک سے اور اساتذہ فخر سے دیکھتے تھے۔

دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تو یہاں کے علماء نے دستار فضیلت سے نوازا۔ شیخ حسام الدینؒ نے آپ کو الوداع کہا تو علم کی طلب ابھی تک سینے میں موجزن تھی۔ آپ نے بخارا کو خیر باد کہا اور سمرقند جانے کا ارادہ کیا۔ سمرقند بھی بخارا سے ہمسری کا دعوے دار تھا۔ یہاں بھی ایک سے ایک عالم موجود تھا۔ پڑھنے کے مواقع دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ سمرقند جانے کا فیصلہ نہایت بروقت تھا۔ آپ بخارا سے نکلے اور راستے کی مشکلات طے کرتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے بخارا سے روانہ ہونے سے قبل ہی معلوم کر لیا تھا کہ سمرقند میں انہیں کس عالمِ دین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا ہے۔ چنانچہ سمرقند پہنچتے ہی آپ نے مولانا شرف الدین کے مدرسے میں داخلہ لے لیا۔ قرآن پاک جو حفظ کرنے سے ادھورا رہ گیا تھا۔ اسے پورا کیا اور پھر جملہ دینی علوم میں سند حاصل کی۔

اب انہیں گھر سے نکلے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے اور عمر مبارک 23 سال ہو گئی تھی۔ دینی و عقلی علوم حاصل کر لیے تھے لیکن تسکین قلب کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ علوم ظاہری کی اہمیت اپنی جگہ لیکن دل کچھ اور ڈھونڈ رہا تھا۔ ابراہیم قندوزی کا دیا ہوا کھلی کا ٹکڑا سینۂ مبارک میں ہلچل ڈالے ہوئے تھا۔ اب انہیں کسی ولی کامل کی تلاش تھی جو انہیں علوم ظاہری سے حقیقت و معرفت کی آخری حدود تک پہنچا دے۔

تصوف کے چار دریا صدیوں سے ساتھ ساتھ بہتے چلے آ رہے تھے۔ انہیں ان دریاؤں میں سے کسی ایک کی شناوری مقصود تھی۔ کس دریا کا پانی کتنا گہرا تھا۔ اس کا فیصلہ کوئی ماہر تیراک ہی کر سکتا تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ رب کریم پر چھوڑا کہ وہ انہیں کس دریا پر لے جا کر کھڑا کرتا ہے۔ اور کسی رہنما کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ بغداد ہی وہ سرزمین ہے جہاں پر سلسلۂ تصوف کے اولیائے کبار اپنی روحانیت سے مردہ دلوں کو بیدار کر رہے ہیں۔ بے شمار بزرگانِ دین کے مزارات ہیں جو انوارِ الٰہیہ تقسیم کر رہے ہیں۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ سمرقند کی گلیوں میں چلتے ہوئے پاؤں جلنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ لیکن ایک زنجیر ایسی تھی جو انہیں روکے ہوئی تھی۔ بغداد پہنچ کر وہ کس دروازے کا انتخاب کریں؟ انہوں نے

فقیروں کے تکیوں کے صدہا چکر لگائے۔ خانقاہوں میں جا کر بیٹھے۔ درویشوں اور مجذوبوں سے معلومات کرتے رہے۔ کئی اولیائے کرام کے تذکرے سنے۔ پھر ایک روز حضرت عثمان ہرونی کا تذکرہ نکل آیا۔ کوئی درویش نہایت جوش و خروش سے آپ کی کرامات بیان کر رہا تھا۔ آپ کو ان کرامات سے کوئی غرض نہیں تھی، آپ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ اس نام پر ان کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔ دل کے کسی گوشے سے آواز آئی یہیں سے تجھے مراد ملے گی۔ آپ نے درویش کا تکیہ چھوڑا اور راستے کے لیے کچھ سامان خرید کر شہر کا دروازہ بھی چھوڑ دیا۔

آپ نے تیزی سے بغداد کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ شب باشی کے لیے جہاں پڑاؤ ڈالتے' حضرت عثمان ہرونی کا ذکر سننے کو ملتا۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ ہستی ضرور میری رہنمائی کرے گی۔ اسی لیے قدرت بار بار اس نام کو میرے سامنے لا رہی ہے۔ اشتیاقِ دید نے ایسا زور باندھا کہ کئی کئی منزلیں پڑاؤ کیے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ جیسے جیسے منزل قریب آ رہی تھی۔ درویشوں کی سنائی ہوئی کرامات ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ ایک نادیدہ رعب تھا جو دل کو اپنے حصار میں لیتا جا رہا تھا۔ کسی مقربِ الٰہی کی بارگاہ میں حاضری کا یہ پہلا سفر تھا۔ قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ شوق تھا کہ ہمت بڑھا رہا تھا۔

بغداد کا دروازہ سامنے تھا۔ یہاں پہنچ کر ایک اور خیال نے دامن تھام لیا۔ والدِ گرامی حضرت غیاث الدینؒ کا مزار بھی یہیں تھا۔ اسی شہر میں آپ کے ماموں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ تھے، کچھ دیر کو جی چاہا ملاقات کریں لیکن مرشد حضرت عثمان ہرونی کی خدمت میں پہنچنے کی ایسی جلدی تھی کہ رکے بغیر آگے بڑھ گئے۔ حضرت عثمان کا آستانہ بغداد سے ایک ڈیڑھ منزل کے فاصلے پر تھا۔ طلب صادق تھی، یہ فاصلہ ہی کتنا تھا۔ تھکن اتارنے کو بھی بغداد میں نہیں ٹھہرے اور "ہرون" پہنچ گئے۔

"دوست! حضرت خواجہ عثمان ہرونی کا آستانہ عالیہ کدھر ہے؟"

"یہاں سے سیدھے جا کر بائیں طرف مڑ جانا۔ ایک عمارت نظر آئے گی، وہی آپ کا آستانہ ہے۔"

آپ نے راہ گیر کے مشورے پر عمل کیا۔ ایک پرانی عمارت سامنے تھی۔ کتنی منزلوں کا سفر طے کرنے کے بعد اس عمارت کا دیدار نصیب ہوا تھا۔ آنکھیں دیواروں کو چومنے میں مشغول ہو گئیں' اس خیال سے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی کہ ان دیواروں کے پیچھے وہ بزرگ ہستی تشریف فرما ہے جس کی کرامات کے تذکرے سمرقند و بخارا تک پہنچے ہوئے ہیں، کیا

چند فرمودات خواجہ بزرگ

☆ قرآن مجید کا دیکھنا ثواب' پڑھنا اور سمجھنا ثواب ہے' حرف پر نگاہ پڑے' دس گناہ دور ہوں اور دس نیکیاں درج ہوں۔ اس سے آنکھ کی روشنی بڑھتی اور امراضِ چشم سے نجات ملتی ہے۔

☆ درویشی اس کا نام ہے کہ جو آئے محروم نہ جائے۔ اگر بھوکا ہے تو کھانا کھلائے' اگر ننگا ہے تو نفیس کپڑا پہنائے۔

☆ گناہ تمہیں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا مسلمان بھائی کو ذلیل و خوار کرنا۔

خبر میری حاضری قبول بھی ہوتی ہے یا نہیں۔

عمارت کے باہر کھڑے ہوئے کتنی دیر گزر گئی خود انہیں بھی خبر نہ ہو سکی۔ خبر کیا ہوتی' ہوش ہی کب تھا۔ وہ تو اس وقت چونکے جب ایک شخص کو خانقاہ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

"حضرت خواجہ اندر تشریف رکھتے ہیں۔ آپ بے شک جا سکتے ہیں۔" اس شخص نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

حضرت معین الدینؒ کو یہ محسوس ہوا جیسے باریابی کی اجازت مل گئی ہو۔ جیسے منزل نے خود انہیں آواز دی ہو۔ انہوں نے اپنے جوتے باہر ہی چھوڑے اور خود ڈرتے ڈرتے خانقاہ میں داخل ہو گئے۔

ایک کشادہ کمرے میں کچھ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔ چہرۂ مبارک پر نور برس رہا تھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ ان میں خواجہ عثمان ہرونی کون ہیں۔

آپ جیسے ہی اس تنہائی میں مخل ہوئے' خواجہ عثمان نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ "بیٹا! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" حضرت خواجہ نے کہا۔

ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ شرابِ معرفت نے اپنا اثر دکھایا۔ حضرت معین الدینؒ والہانہ آگے بڑھے اور مرشد کے قدموں سے لپٹ گئے۔ مرشد نے نہایت شفقت سے آپ کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم آؤ گے اور اپنی امانت جو میرے پاس محفوظ ہے' آ کر حاصل کرو گے۔"

امانت لینے والا آ گیا تھا لہٰذا منتقلی میں دیر کی گنجائش نہیں تھی' دوسرے ہی دن حضرت عثمان انہیں لے کر بغداد میں مسجدِ جنید پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں اولیائے کرام موجود تھے۔ گویا

رسم بیعت کی ادائیگی کا وقت آ گیا تھا۔
"معین الدینؒ تازہ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرو۔"
حضرت خواجہ عثمان ہرونی نے حکم دیا۔
جب آپ حکم کی تعمیل کر چکے تو فرمایا "قبلہ رو بیٹھ کر سورۂ بقرہ پڑھو۔"
آپ نے تلاوت شروع کر دی جب سورۂ بقرہ پڑھ چکے تو حکم ہوا "اکیس مرتبہ سبحان اللہ پڑھو۔" جب وہ اس مرحلے سے گزر گئے تو مرشد نے ان کا ہاتھ پکڑا "آؤ میں تمہیں اللہ ذوالجلال تک پہنچا دوں۔" اور پھر اپنے دست مبارک سے حضرت معین الدینؒ کے سر پر کلاہِ چہار ترک رکھی اور فرمایا "بیٹھ جاؤ۔"
جب آپ بیٹھ گئے تو مرشد نے فرمایا "ہمارے سلسلے (چشتیہ) میں ایک دن رات کا مجاہدہ ہے لہٰذا آج کا دن اور رات ذکر و عبادت میں گزارو۔"
یہاں کیا دیر تھی۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ آپ گوشۂ تنہائی میں چلے گئے اور ذکر و اذکار میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے دن حسبِ ارشاد آپ مرشد کی خدمت میں پہنچے اور دو زانو بیٹھ گئے۔
"اوپر دیکھو اور بتاؤ کہاں تک نظر جاتی ہے۔"
"سرکار! عرش اعظم تک۔"
"اب زمین کی طرف دیکھو اور بتاؤ کہاں تک نظر جاتی ہے۔"
"سرکار تحت الثریٰ تک۔"
حضرت خواجہ عثمان کا تصوف اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ جو کچھ دکھانا چاہ رہے تھے دکھائی دے رہا تھا۔ حضرت معین الدینؒ کے لیے یہ نظارے عجائبات سے کم نہیں تھے لیکن ابھی تو اور بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔
"ایک ہزار مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھو۔" مرشد کے لبوں کو جنبش ہوئی۔
جب یہ عمل پورا ہوا تو مرشد نے فرمایا "پھر آسمان کی طرف دیکھو۔"
آپ آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کانوں سے آواز ٹکرائی "کہاں تک دیکھ سکتے ہو؟"
"حجابِ عظمت تک" حضرت معین الدینؒ نے بے خودی میں جواب دیا۔
"اب اپنی آنکھیں بند کرو۔"
آپ نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد تعمیل حکم میں آنکھیں کھولیں تو مرشد نے اپنی دو انگلیاں آپ کے سامنے کیں۔
"کیا دیکھتے ہو؟"
"یا حضرت! اٹھارہ ہزار عالم دو انگلیوں کے درمیان دیکھ رہا ہوں۔"
"بس معین الدینؒ تمہارا کام پورا ہو گیا۔" مرشد نے فرمایا "اب کچھ عرصہ ہمارے پاس رہو۔"
ہرون میں عبادت کے لیے آپ کو علیٰحدہ کمرا دے دیا گیا اور کچھ وظائف دے دیے گئے۔ حضرت معین الدینؒ سلوک کی پہلی منزل پر قدم رکھ چکے تھے۔ عرشِ اعظم، حجابِ عظمت اور تحت الثریٰ کا مشاہدہ کر چکے تھے لیکن ہاتفِ غیبی مسلسل صدا دے رہا تھا۔

ابھی تو اور بہت آسمان دیکھنے ہیں
یہ آسمان یہ پہلی اڑان کچھ بھی نہیں

عزلت نشینی کا یہ عرصہ ڈھائی سال تک پھیل گیا۔ آپ کے کمرے سے اللہ اللہ کی روح پرور آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ان کی دنیا ایک کمرے میں سمٹ گئی تھی۔ خدا جانے کیسے کیسے اسرار کھلے۔ راز و نیاز کی کیسی کیسی باتیں ہوئیں۔
ایک دن مرشد کا حکم پہنچا اور آپ گوشہ نشینی سے باہر آ گئے۔ "معین الدینؒ اب کچھ وقت میرے ساتھ گزارا کرو۔" آپ نے ادب سے سر جھکا دیا۔
سماع کی محفلیں سجتی تھیں۔ علم و عرفان و ذکر کی مجالس بھی برپا ہوتی تھیں۔ غرض مند دیوانے 'محبت کے پیاسے' صراطِ مستقیم کے متلاشی بھی درِ اقدس پر دستک دیتے تھے۔ حضرت معین الدینؒ ان محفلوں کا خاموشی سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ بھی تربیت کا ایک حصہ تھا۔
جب یہ تربیت بھی مکمل ہوئی تو ارشادِ مرشد ہوا "بیٹا معین الدینؒ دنیا تجربہ گاہ ہے۔ زمانہ سب سے بڑا استاد ہے۔ سیاحت سے انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے ان کا کتب میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے لازم ہے کہ تم حجرے کی دنیا سے نکل کر دنیا کی وسعتوں میں گشت کرو اور جب مشاہدات سے دامن بھر جائے تو لوٹ آنا۔"
حضرت معین الدینؒ کے دل پر کسی نے چھریاں چلا دیں سمجھ گئے کہ فراق کی گھڑیاں نزدیک ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔
"یا مرشد! میری تمنا ہے کہ تاحیات آپ کے قدموں میں پڑا رہوں۔"
"گھبراؤ نہیں۔ انشاء اللہ ہر مقام پر تم ہمیں اپنے ساتھ پاؤ گے۔"

"آپ بہتر سمجھتے ہیں۔" کہنے کو تو آپ نے کہہ دیا اور اٹھ کر اپنے حجرے میں آ گئے لیکن فراق کے انگاروں پر آنسوؤں کی وہ بارش ہوئی کہ رخسار مبارک بھیگ گئے۔ نفیِ ذات کی یہی تو وہ تعلیم تھی۔ جس سے ان کا مرشد انہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اب اپنی نہیں مرشد کی رضا پر راضی ہونا تھا۔

خانقاہ سے باہر نکلے تو جدائی کے احساس سے ایک مرتبہ پھر آنکھیں نم ہو گئیں۔ بڑی دیر تک در و دیوار کو تکتے رہے اور پھر ایک طرف کو چل دیے۔ ایک مرتبہ پھر کسی نامعلوم منزل کی طرف سفر درپیش تھا۔ مرشد کی دعاؤں کے سوا کچھ ساتھ نہ تھا۔ نہ زادِ راہ نہ ساتھی، قدم خود بخود سفر کر رہے تھے، شہر کب کا پیچھے رہ گیا تھا آگے ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔

چند دنوں کی مسافت کے بعد آپ ایک پہاڑی مقام پر پہنچے۔ دور کچھ فاصلے پر آبادی کے آثار نظر آئے۔ آپ کے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔ دھول اڑاتا ایک اونٹنی سوار چلا آ رہا تھا۔ آپ راستے سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی وہ سوار قریب آیا آپ نے بلند آواز میں پوچھا۔

"سامنے کون سا قصبہ ہے؟"

"یہ سنجار ہے۔" سوار نے جواب دیا اور دوسری سڑک پر ہو لیا۔

آفتاب، شفق کی سرخی سے وضو کر رہا تھا مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا۔ آپ نے قدموں کی رفتار بڑھا دی تاکہ بستی میں پہنچ کر کسی مسجد کو تلاش کر سکیں۔

بستی میں داخل ہوتے ہی اذان کی آواز نے آپ کو اپنی طرف بلا لیا، "اللہ بہت بڑا ہے" مسجد کے مینار آپ کے استقبال کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ جماعت تیار تھی۔ آپ بھی شامل ہو گئے۔

نماز سے فراغت کے بعد آپ مسجد ہی میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ اب آپ کو یہ طے کرنا تھا کہ رات کہاں گزاری جائے۔ اجنبی چہرہ مسافر ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ لوگ آپ کے گرد جمع ہونے لگے۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" کئی آوازیں ایک ساتھ جواب طلب ہوئیں۔

"ہرون سے" آپ نے فرمایا۔

"حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے قصبے سے؟" خوشی اور حیرت کی کئی آوازیں فضا میں ابھریں۔

"آپ کی ان سے ملاقات تو رہی ہوگی۔"

"وہ میرے پیر و مرشد ہیں۔"

"آپ ان کے مرید ہیں؟ کیا نام ہے آپ کا۔"

"معین الدین۔"

یہ سننا تھا کہ لوگ آپ کے گرد مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ عثمان ہرونی کا مرید اور ان کے قصبے میں۔ یہ تو برکتوں کے نزول کی گھڑی ہے۔ مرید بھی اکیلا نہیں ہوتا اس کا مرشد ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ گویا عثمان ہرونی بھی یہیں تشریف فرما ہیں۔

"سنجار میں کوئی آپ کا شناسا ہے؟" ایک شخص نے پوچھا۔

"نہیں"

"آج آپ میرے مہمان ہیں۔ تشریف رکھیں میں کھانا لے کر آتا ہوں۔"

"کیوں تکلیف کرتے ہو بھائی، مسافر ہوں کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔"

"کھانے کی ضرورت تو وہاں بھی پڑے گی۔ پھر اس خدمت کا موقع مجھے کیوں نہیں دیتے۔ آپ مسافر بھی ہیں اور اتنی بڑی ہستی کے مرید بھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خدمت کا یہ موقع ہاتھ سے نکال دوں۔"

آپ نے اس شخص کے اصرار کی لاج رکھی۔ وہ شخص بھاگا ہوا گیا اور کھانا لے آیا۔ جب آپ کھانا تناول فرما چکے اور چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ شخص ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"حضرت شیخ نجم الدین آج کل اسی قصبے میں مقیم ہیں۔ ولی کامل ہیں۔ میرا تو مشورہ یہ ہے کہ آپ جب یہاں آ ہی گئے ہیں تو ان کی زیارت کیے بغیر نہ جائیں۔"

"یہ تم نے خوب کہی، اولیا اللہ کی صحبت تو میرا شغل خاص ہے اب میں ان سے ملاقات کیے بغیر کیسے جا سکتا ہوں۔ چلو ابھی چلتے ہیں۔"

"آج رات مجھے اپنی خدمت میں رہنے دیں۔ حقِ میزبانی ادا کرنے دیں۔ صبح تشریف لے جائیں۔"

"بھائی جیسی تمہاری مرضی۔"

عشا کی نماز کے بعد سنجار کے بہت سے مردانِ صالح آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ باتوں میں رات کٹنے لگی۔ موضوعِ گفتگو حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کی ذات والا صفات تھی۔ ان کے بارے میں جو جتنا جانتا تھا بیان کر رہا تھا۔ آپ کی

عظمتوں کے نئے نئے پہلو سامنے آرہے تھے۔ حضرت معین الدینؒ دل ہی دل میں اپنے مرشد کے تصرف کے قائل ہوتے جارہے تھے کہ مرشد نے ایک ایسے قصبے میں پہنچادیا جہاں ایسا ولی کامل مقیم ہے۔ یہ مرشد کی عطائے خاص نہیں تو اور کیا ہے۔

رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہورہے تھے۔ یہاں تک کہ میزبان حقِ خدمت کے لیے بیٹھا رہ گیا، اب وہ بھی سوچ رہا تھا کہ محترم مہمان کو آرام کا موقع دے۔

''آپ بہت تھک گئے ہیں۔ کچھ دیر آرام فرمالیں۔''

''شیخ نجم الدین کے بارے میں آپ اور کیا جانتے ہیں۔ کچھ اور بیان کیجئے کہ یہ رات اسی بابرکت تذکرے میں گزرجائے۔'' حضرت معین الدینؒ نے فرمایا۔

وہ شخص حضرت شیخ کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا بیان کرنے لگا، معین الدینؒ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھے کہ کل کا سورج انہیں ایسے کامل بزرگ کی صحبت میں جائے گا۔

پردۂ شب آہستہ آہستہ سمٹنے لگا۔ آثارِ صبح نمودار ہوئے۔ موذن کی آواز نے ماحول کو مسحور کردیا۔ اللہ کے نیک بندے مسجد میں داخل ہونے لگے۔ خواجہ معین الدینؒ بھی بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہوئے۔

نماز اور وظائف سے فارغ ہوئے تو شہنشاہ خاور تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوچکا تھا۔ آپ نے اپنی بے تابی کا اظہار اپنے میزبان سے کیا اور اس کے ہمراہ حضرت نجم الدین کبریٰ کی قیام گاہ کی طرف چل دیے۔

ابھی آپ خانقاہ کے دروازے پر ہی تھے کہ اندر سے آواز آئی ''معین الدینؒ باہر کیوں رک گئے، اندر چلے آؤ۔'' آپ نے بے کھٹک خانقاہ میں قدم رکھ دیا۔ کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ سب ایک نوجوان کو اندر آتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ناآشنائی کی حیرانی ان کی آنکھوں سے ظاہر تھی۔ یہ حیرانی اس وقت اور بڑھ گئی جب شیخ نجم الدین کبریٰ نے مسکراکر ان کا استقبال کیا اور بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھالیا۔ جلد ہی یہ حیرانی دور ہوگئی ''عثمان ہرونی کا مرید ہمارے پاس آیا ہے۔'' حضرت شیخ نجم الدین نے حاضرین کو مخاطب کرکے کہا اور پھر نووارد مہمان سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگے سفر کے حالات پوچھنے لگے۔

''کچھ دن ہمارے پاس رہو۔'' شیخ نے فرمایا۔

''میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔'' آپ نے فرمایا۔

خط بنام حضرت قطب الدین کاکیؒ

اللہ الصمد کے اسرار سے واقف، لم یلد ولم یولد کے انوار کے ماہر میرے بھائی قطب الدین

فقیر پر تقصیر معین الدین سنجری کی طرف سے خوشی وخرمی آمیز اور انس ومحبت بھرا اسلام پہنچے۔

بھائی میرے شیخ حضرت خواجہ عثمانی ہرونیؒ فرماتے ہیں سوائے اہلِ معرفت کے کسی اور کو عشق کے رموزات سے واقف نہیں کرنا چاہیے...... مال و مرتبہ بڑے بھاری بت ہیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو سیدھی راہ سے گمراہ کیا اور کررہے ہیں۔ پس جس نے جاہ و مال کی محبت کو دل سے نکال دیا اس نے گویا پوری نفی کردی اور جسے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی اس نے پورا پورا اثبات کرلیا۔

فقیر معین الدین چشتی سنجریؒ

تربیت کے نئے دروازے کھل گئے، شب وروز عبادت میں گزرنے لگے، واعظ وتلقین کی محفلیں سجتیں۔ حضرت نجم الدین لب کشائی فرماتے علم وحکمت کے موتی برساتے، حضرت معین الدینؒ جلدی جلدی ان موتیوں سے اپنا دامن بھررہے تھے کہ نہ جانے کب یہ بارش تھم جائے کب اذنِ سفر ہو اور یہاں سے جانا پڑجائے۔

آخر یہ مرحلہ ایک دن آ ہی گیا۔ ڈھائی ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ شیخ نجم الدین نے آپ کو خلوت میں طلب فرمایا ''معین الدینؒ عنقریب ہم اس جگہ کو چھوڑنے والے ہیں۔ بہتر ہے اب تم جاؤ۔ ابھی کئی مراحل طے کرنے کے لیے تمہارے سامنے ہیں۔''

ایک مرتبہ پھر وہی صورتِ حال سامنے تھی جو ہرون سے چلتے وقت ہوئی تھی' کہاں جانا ہے؟ یہ اس وقت بھی معلوم نہیں تھا اور اب بھی کچھ طے نہیں ہوا تھا انہوں نے منزل کا تعین عالم غیب کے سپرد کیا اور کسی انجانے راستے پر قدم رکھ دیا۔

دشت لے جائے کہ گھر لے جائے
تیری آواز جدھر لے جائے

کئی دنوں کے سفر کے بعد آپ نے اپنے آپ کو کوہ جودی کے دامن میں واقع قصبہ ''جیل'' یا ''جیال'' (یا جیلان) میں پایا۔ اسی قصبے کی نسبت سے حضرت عبدالقادرؒ کو جیلانی کہا جانے لگا۔ یہی وہ پہاڑ (جودی) تھا جس پر

حضرت نوحؑ کی کشتی آ کر رکی تھی۔ اس پہاڑ کو دیکھتے ہی عبرت کے کئی مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔

''یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں رات بسر کی جاسکے؟'' انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔

''یہاں تو غوثِ وقت، محبوب سبحانی قیام رکھتے ہیں پھر آپ کو کیا فکر ہے۔ ان کی مہمانی کے مزے لوٹئے۔'' راہ گیر نے جواب دیا۔

''کیا اسمِ گرامی ہے ان بزرگ کا؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''حضرت عبدالقادر جیلانیؒ۔''

اس نام نے ایسا اثر کیا کہ لہو جوش مارنے لگا۔ چہرہ گلاب ہوگیا۔ پورے وجود میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ یہ شخص تو میرے ماموں جان کا پتا بتا رہا ہے۔ کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جب بتاؤں گا کہ میں ماہ نور کا بیٹا ہوں تو انہیں کتنی خوشی ہوگی۔ ماں کا خیال آتے ہی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اماں جان کی زندگی میں کبھی ماموں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ملاقات کا وقت آیا تو اماں اس دنیا میں نہیں۔

انہوں نے راہ گیر سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے آستانے کا پتا دریافت کیا اور وہاں پہنچ گئے۔ آستانے پر لوگوں کا ہجوم تھا، حضرت عبدالقادر وعظ و نصیحت فرما رہے تھے۔ آپ بھی ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گئے۔

جب بیان ختم ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پیرانِ پیر کے پاس پہنچ کر ان کے قدموں سے لپٹ گئے۔ پیرانِ پیر نے سمجھا ہوگا کوئی مظلوم دکھیارا جو اپنی کوئی غرض لے کر آیا ہے۔ آپ کی پشت پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹا کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

''حضرت مجھ ناتواں کو معین الدینؒ حسن سنجری کہتے ہیں، میرے والد غیاث الدینؒ حسن تھے، حضرت عثمان ہرونی کا مرید ہوں۔''

یہ سنتے ہی حضرت عبدالقادر کی بھی وہی حالت ہوئی جس خوشی سے حضرت معین الدینؒ کچھ دیر پہلے دوچار ہوئے تھے۔

''تم ہماری بہن کے لختِ جگر ہو؟''

''جی ماموں جان۔''

حضرت عبدالقادر نے انہیں سینے سے لگایا ''اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم تو میری مرحوم بہن کی نشانی ہو۔''

''حضرت مجھے تو سیر و سیاحت کا حکم ہوا ہے۔''

''ہم جانتے ہیں لیکن کچھ عرصہ تو ہمارے پاس رہو۔''

''ماموں جان اس میں مضائقہ نہیں۔''

اس در کی دربانی کی شان ہی نرالی تھی۔ پہلے ہی دن محفل واعظ منعقد ہوئی تو پچاس کے قریب مشائخ وقت حاضر تھے۔ فیوض و برکات کی ایسی بارش ہوئی کہ معین الدینؒ سر سے پاؤں تک بارشِ نور میں بھیگ گئے۔

یہ محفلیں روز کا معمول تھیں۔ خواجہ معین الدینؒ ان محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ حقیقت و معرفت کی چابیاں ایک ایک کرکے آپ کے ہاتھ میں آتی رہیں۔ غوث الثقلین کی محفل میں آنے والے بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ وہ اس خزانے سے فیض یاب ہوتے رہے۔

ایک دن نورانی محفل برپا تھی۔ حضرت غوث اعظم نے خواجہ معین الدینؒ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ ''یہ مرد مقتدائے مشائخ زمانہ ہوگا، بہت سے لوگ اس کے ذریعے منزلِ کمالات تک پہنچیں گے۔''

اس اشارے سے حضرتِ معین الدینؒ نے معلوم کرلیا کہ اس در پر ہونے والی تربیت مکمل ہوئی۔ اب انہیں آگے بڑھنا چاہئے۔ آپ کو یہاں رہتے ہوئے پانچ ماہ اور سات دن ہوچکے تھے کہ انہوں نے رخصت کی اجازت طلب کی۔ حضرت غوثِ اعظم نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

رخصت کا وقت قریب تھا کہ حضرت غوث اعظم نے آپ کو اپنے قریب بلایا اور سرگوشی میں ایک شغل کی تعلیم دی جسے طریقۂ چشتیہ میں شغل سرگوشی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آپ نے اس ''شغل سرگوشی'' کو لوحِ قلب پر نقش کیا اور جیلان سے روانہ ہوگئے۔ جیلان سے بغداد سات دن کی مسافت پر تھا۔ اب ان کا رخ اس طرف تھا جہاں کئی انبیائے کرام اور اولیا اللہ کے مزاراتِ مقدسہ تھے۔ راستے میں کئی مقامات پر رکتے ہوئے عروس البلاد بغداد میں داخل ہوگئے۔

بغداد کی زمین پر قدم رکھتے ہی آپ کو مشفق باپ کی یاد آگئی۔ انہیں معلوم تھا کہ حضرت غیاث الدینؒ کو بغداد ہی میں دفن کردیا گیا تھا لیکن کہاں دفن ہیں یہ معلوم نہیں تھا۔ یہ معلوم کرنا دشوار نہیں تھا۔ بغداد کے ہر شہری کو معلوم تھا کہ غیاث الدینؒ نوری کا مزار کہاں ہے۔

آپ مزار پر پہنچے تو کچھ لوگ کھڑے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ بچپن کے کئی واقعات تصویر بن کر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے وہ زمانہ یاد آیا جب وہ باپ کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے نیشاپور آئے تھے۔ پھر نیشاپور میں ہونے والی خوں ریزی

نگاہوں کے سامنے گھوم گئی۔ مہربان ماں کی یاد آ گئی، بھائیوں اور بہنوں کی صورتیں سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ زباں پر آیاتِ قرآنی جاری تھیں۔ اور پھر بارگاہ خداوندی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ بڑی دیر تک دعا کو ہاتھ اٹھے رہے۔ پھر قدم بوسی کی اور احاطۂ مزار سے باہر نکل آئے۔ کسی کو خبر تک نہ ہو سکی کہ ابھی جو شخص باہر نکلا ہے صاحب مزار کا بیٹا ہے۔

یادوں کی دھوپ چھاؤں ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ تھکن کا احساس اچانک بڑھ گیا تھا۔ وہ جلد از جلد یادوں کے اس دائرے سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف کو چل دیئے۔ کچھ دور چل کر اچانک قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ رک کر کھڑے ہو گئے اور حیران تھے کہ ہمت نے جواب کیوں دے دیا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک خانقاہ دکھائی دی۔ آپ دل ہی دل میں مسکرا دیے، ٹھیک ہے حضرت ...... بلانے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ وہ اس خانقاہ کی جانب چل پڑے۔ یہ حضرت شیخ ابو النجیب سہروردی کا ڈیرا تھا۔ بارہ واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا کر ملتا تھا۔ علومِ ظاہری و باطنی میں باکمال تھے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کسی انجانی ڈوری میں بندھے خانقاہ تک پہنچ گئے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے، شیخ ابو النجیب کی آنکھوں نے دروازے کا طواف کیا۔

"آؤ بیٹا! ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"آپ کی کشش ہی تو مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔"

"اب آ ہی گئے ہو تو کچھ عرصہ ہمارے پاس رہو گے۔"

"تابِ انکار کس کو ہے۔"

حضرت شیخ ابو النجیب سہروردی نے خادم کو طلب کیا اور حضرت معین الدینؒ کی رہائش کے انتظام کا حکم دیا۔ بزرگ کی صحبت سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن شیخ کے اصرار پر کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے آپ کو حجرے میں جانا پڑا۔

حضرت شیخ ابو النجیب تصوف کے سلسلۂ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے جبکہ خواجہ معین الدینؒ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔ لیکن شاید قدرت کا تقاضا تھا کہ وہ دریائے تصوف کی اس لہر سے بھی واقف ہو جائیں۔ اسی لیے قدرت آپ کو یہاں لے آئی تھی۔

صوفیوں کی ایک جماعت خانقاہ میں داخل ہوئی۔ خاطر مدارات کے بعد محفل منعقد ہوئی۔ خواجہ معین الدینؒ کو بھی طلب کیا گیا۔ شیخ ابو النجیبؒ نے آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ اس وقت صوفیا کے اخلاق کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ حضرت شیخ ابو النجیب فرما رہے تھے۔

"تصوف تمام تر اخلاق ہی کا نام ہے۔ جس کا اخلاق زیادہ اچھا ہو گا اس کا تصوف زیادہ ہو گا۔" اس کے بعد فرمایا "صوفیوں کے اخلاق میں حلم، تواضع، نصیحت، شفقت، برداشت، موافقت، احسان، مدارات، ایثار، خدمت، الفت، بشاشت، فتوت، کرم، بذل جاہ، مروت، تلطف، طلاقت، سکون، وقار اور جو اس کے ساتھ زیادتی کرے اس کے لیے دعا کرنا۔ جو ان کی تعریف کرے ان کے ساتھ حسن ظن رکھنا۔ اپنے نفس کو چھوٹا سمجھنا۔ بھائیوں کی توقیر کرنا۔ مشائخ کی تعظیم کرنا۔ چھوٹوں بڑوں پر ترحم کرنا۔ جو کچھ کسی کو دے، اگرچہ بہت ہو، اس کو کم سمجھنا اور جو کچھ کسی سے لے، اگرچہ وہ کم ہو، اس کو زیادہ جاننا، یہ سب باتیں داخل ہیں۔"

شیخ ابو النجیب کے دہنِ مبارک سے پھول جھڑ رہے تھے۔ محفل میں ہر شخص اپنی ذات کا احتساب کر رہا تھا کہ اس کے اندر ان میں سے کتنے اوصاف ہیں، خواجہ معین الدینؒ متبسم تھے کہ تربیت کے اس گوشے کی تکمیل کے لیے انہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔

ان پر یہ عقدہ جلد ہی کھل گیا کہ یہ خانقاہ تربیت کے کسی ایک پہلو تک ہی محدود نہیں ہے۔ حضرت شیخ ابو النجیب کی محفل میں علما، ہدایت کے طالب، بزرگ اور علمِ دین کے متلاشی ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ کبھی فقر و غنا پر گفتگو ہوتی، کبھی سخاوت و عطا کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ کبھی تصوف کے طبقات کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ خواجہ معین الدینؒ ان نورانی محفلوں کی جان بنے ہوئے تھے۔ ایک ایک حرف کو اپنے سینے میں اتار رہے تھے۔

خواجہ معین الدینؒ خانقاہ سہروردیہ کی ان محفلوں تک محدود نہیں تھے۔ کبھی جامع مسجد میں جا نکلتے، کبھی مزاروں کی زیارت کرتے، کبھی دریا کی سیر کو نکل جاتے۔ درویشوں کی کمی نہیں تھی۔ نصیحت کے پھول جہاں ملتے، چن لیتے۔

ایک روز خانقاہ سہروردیہ میں انسانی اعضا کے ادب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ حضرت شیخ ابو النجیب آنکھوں، قلب، زبان اور دیگر اعضاء کے آداب کے بارے میں رطب اللسان تھے۔

"قلب کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمانوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھے۔"

"ہاتھ کا ادب یہ ہے کہ بذل و احسان اور بھائیوں کی خدمت کرے اور اپنے ہاتھوں سے معصیت کا کوئی کام نہ

کرے۔"

"آنکھ کا ادب یہ ہے کہ حرام چیزوں کو لوگوں اور اپنے بھائیوں کے عیوب و منکرات و محرمات دیکھنے سے آنکھ بند کرے۔"

ماحول پُراسرار خاموشی کی گرفت میں تھا۔ حضرت معین الدینؒ بھی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، اچانک ان کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ اب یہاں سے رخصتی کا وقت آ گیا ہے۔

اسی خیال نے حضرت شیخ ابوالنجیب کے دروازۂ دل پر بھی دستک دی تھی۔ آپ نے حاضرین کو جانے کا اشارہ کیا اور لوگ ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ خواجہ معین الدینؒ بھی اپنی جگہ سے اٹھے۔ حضرت شیخ نے چشم ابرو سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تمام لوگ اٹھ کر جا چکے تھے۔ خانقاہ میں پُراسرار خاموشی پہرا دے رہی تھی۔ دو ہستیاں موجود تھیں اور دونوں خاموش تھیں۔ آخر شیخ ابوالنجیب نے اس خاموشی کو توڑا۔

"معین الدینؒ! ہم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ تمہیں ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔"

حضرت خواجہ سنجری کو اپنے کشف کی صداقت پر یقین آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ رخصت کا وقت قریب ہے۔ اسی لیے حضرت شیخ یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہم نے اپنا حق ادا کر دیا۔"

"یا شیخ! آپ کی دعا کی برکت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

حضرت شیخ ابوالنجیب نے محبت سے آپ کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور دعائے خیر کی۔ عجیب سماں تھا۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

☆☆☆

سورج کی تمازت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خواجہ معین الدینؒ نے کندھے پر پڑے ہوئے بڑے رومال کو سر پر لپیٹ لیا تھا۔ لبوں پر ذکر جاری تھا اور قدم تیزی سے کسی نامعلوم منزل کی طرف اٹھ رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انہیں جانا کہاں ہے۔ دور تک صحرا تھا، سناٹا تھا۔ نہ کوئی زادِ راہ تھا نہ کوئی ساتھی ساتھ تھا۔ آپ چلتے رہے، جہاں رات پڑ جاتی رک جاتے۔ جو مل جاتا شکر کر کے کھا لیتے۔ آخر کار آپ بصرہ پہنچ گئے۔

بصرہ میں چند روز قیام کے بعد پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ تجربات و مشاہدات سمیٹتے ہوئے آپ ملکِ شام کے قریب ایک شہر میں پہنچ گئے ابھی شہر میں داخل ہونے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ شہر سے باہر ایک غار نے آپ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ آپ نے غار کے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نورانی بزرگ تشریف فرما نظر آئے۔ اشتیاقِ ملاقات میں قدمِ مبارک غار کے اندر رکھا ہی تھا کہ دو شیر کھڑے دکھائی دیئے آپ جہاں تھے وہیں رک گئے۔

"اندر آ جاؤ، ڈرو مت۔" بزرگ کی آواز گونجی۔

حضرت خواجہ اندر تشریف لے گئے اور ادب سے سلام کر کے بیٹھ گئے۔ بزرگ کی آواز پھر گونجی۔ "جب تیرے دل میں خوفِ خدا ہوگا سب تجھ سے ڈریں گے۔ شیر کی کیا حقیقت ہے۔"

"میں تو اس شہر میں اجنبی ہوں۔ آپ کے نام تک سے واقف نہیں۔"

"میرا نام شیخ اوحد محمد الواحد غزنوی ہے۔"

"آپ اس غار میں کب سے ہیں؟"

"سنو! مجھے اس غار میں رہتے ہوئے کئی سال گزر گئے ہیں۔ تمام خلقت سے گوشہ نشینی اختیار کی ہے لیکن تیس سال سے ایک سبب سے رو رہا ہوں۔"

"حضرت وہ کیا؟"

"جب میں نماز ادا کرتا ہوں تو اپنے آپ کو دیکھ کر روتا ہوں کہ اگر ذرہ بھر بھی شرطِ نماز ادا نہ ہوئی تو سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ اسی وقت یہ طاعت میرے منہ پر دے ماریں گے۔"

حضرت شیخ اس وقت بھی رو رہے تھے۔ خواجہ معین الدینؒ نے آپ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر سکوت رہا پھر حضرت شیخ نے خود ہی سکوت توڑا۔

"میرے بدن پر جو ہڈیاں اور چمڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اسی کے سبب سے ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھ سے نماز کا حق ادا بھی ہوا یا نہیں۔"

بات ختم کرنے کے بعد ایک سیب اٹھایا اور خواجہ معین الدینؒ کو عطا کر کے سر جھکا لیا۔ شاید نماز کی تلقین کے سوا ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ خواجہ معین سوچ رہے تھے 'نماز اس طرح بھی پڑھتے ہیں جو ان بزرگ کا طریقہ ہے۔ کیا غار اور پتھر بھی میری تربیت پر مامور کر دیئے گئے ہیں؟

فضا میں باتیں کرتی ہوئی خاموشی طاری تھی۔ شیروں کے سانس لینے کی آوازوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ نے بھی اس کے بعد کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ لہٰذا اجازت طلب کی۔

وہ غار سے باہر نکلے تو ابھی کافی دن پڑا تھا دھوپ کمزور پڑ

گئی تھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ایک منزل اور سفر کیا جا سکتا تھا۔ بزرگ کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھیں۔ شہر میں داخل ہوئے اور ایک مسجد میں جا کر بیٹھ گئے۔ جماعت کھڑی ہوئی تو آپ بھی شامل ہو گئے' نماز میں جیسی لذت آج مل رہی تھی کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

نماز کے بعد وہ پھر کسی اگلے پڑاؤ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ایک شہر میں پہنچے۔ جب مسافت شب قطع ہوئی صبح نمودار ہوئی تو یہاں سے بھی نکل گئے۔ مختلف قصبات و دیہات سے گزرتے، دن چلتے رات ٹھہرتے، ایک دن شام ہونے کو تھی کہ ہمدان پہنچے۔ یہاں حضرت کھمس بن حسین ہمدانی کا مزار مبارک تھا۔ آپ اس کی زیارت کو پہنچے پھر ایک مسجد میں قیام کے لیے رک گئے۔

اب آپ کے قدم تبریز کی جانب چل رہے تھے۔ تبریز پہنچ کر آپ حضرت شیخ ابو سعید تبریزی کے مہمان ہوئے مزارات پر حاضر ہوتے رہے روحانی و علمی محفلوں سے مستفید ہوئے۔

یہ قدم کسی منزل پر رکنے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔ اللہ کی زمین بہت بڑی تھی اور عمر کے دن کسے معلوم۔ زمین کا چپہ چپہ اللہ کے دوستوں سے بھرا پڑا تھا اور وہ سب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے سفر پر سفر اختیار کر رہے تھے۔ تبریز میں چند دن قیام کرنے کے بعد استرآباد کا رخ کیا۔ یہاں پہنچے تو دیکھا شیخ ناصر الدین سے ایک دنیا فیض یاب ہو رہی ہے۔ ان بزرگ کی عمر ایک سو ستر سال ہو چکی تھی لیکن ہنوز رشد و ہدایت کے چراغ روشن کیے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے مشائخ قدم بوسی کی حسرت میں تڑپتے تھے۔ آستانہ شاہ و گدا سب کے لیے کھلا ہوا تھا۔ وہ بھی حاضر خدمت ہو گئے۔ چشم باطن حرکت میں آئی۔ بزرگ نے کشف سے معلوم کر لیا کہ آنے والا اجنبی نوجوان کون ہے اور اس کی روحانیت سے کتنے چراغ روشن ہوں گے۔ اس چراغ کی حفاظت ہونی چاہیے۔ نہایت شفقت سے بلایا اور اپنے پاس جگہ دی۔

یہ جگہ حضرت خواجہ کو ایسی بھائی کہ جب تک رہے' بزرگ کے پہلو سے ہٹے نہیں۔ عشق و عرفان کے سمندر کے ایک ایک قطرے سے فیض یاب ہوتے رہے۔

جب بہت دن گزر گئے تو بادل نخواستہ اجازت طلب کی۔ بزرگ نے نصیحتوں کے آخری تحفے آپ کے کشکول میں ڈالے اور نم آنکھوں سے الوداع کہا۔

شدت شوق نے پھر فاصلے طے کرنے شروع کر دیے۔ راستے سمٹنے لگے صحرا' باغ بن گئے۔ پہاڑ' میدانوں کا روپ ڈھالنے لگے۔ بالآخر شہر خوباں میں پہنچے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کس راہ چلیں' آواز آئی "معین الدین اس طرف۔" آپ نے شوق کی سواری کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ ہوش آیا تو ایک مزار مبارک سامنے تھا۔ یہ مزار شاہ تصوف حضرت ابو الحسن خرقانیؒ کی آرام گاہ تھا۔

مزار پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ کوئی قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھا۔ کسی کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ کوئی آنسوؤں کے نذرانے پیش کر رہا تھا۔ آپ نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ طویل دعا کے بعد ایک طرف بیٹھ گئے۔ اللہ والوں کی شان ہی نرالی ہے زندگی بھر رشد و ہدایت فرماتے ہیں اور جب مزارات میں آسودۂ خواب ہوتے ہیں تو فیض کا لنگر تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ کیسے کیسے خیال دل میں آئے اور چلے گئے۔

مزار والے نے ایسے قدم پکڑے کہ آپ اٹھنا بھول گئے۔ کسی مزار کے بارے میں سنتے تو وہاں پہنچ جاتے۔ کسی بزرگ کے علم و فضل کا شہرہ سنتے تو اس کی مجلس میں جا بیٹھتے۔ اس شہر اور گرد و نواح کی برکتیں سمیٹتے سمیٹتے دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ خزانے میں اتنے موتی تھے کہ انتخاب کرنا مشکل تھا' فیوض و برکات کی ایسی بہتات ہوئی کہ خود خزینہ دار بن گئے۔

جب کوئی شخص دوران سفر خوب مال اکٹھا کر لیتا ہے تو اسے گھر والے یاد آتے ہیں اور وہ ان سے ملنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ انہیں بھی اپنے روحانی وطن "چشت" کی یاد آئی۔ آپ سلسلۂ چشتیہ سے بیعت تھے اور چشت سلسلہ چشتیہ کا مرکز تھا۔

ایران و افغانستان کی سرحد پر ہرات کے مضافات میں واقع علاقہ چشت' سلسلہ چشتیہ کے عظیم روحانی پیشواؤں کے مزارات کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

چشت کا خیال آتے ہی خواجہ سنجری کو اپنے روحانی اکابرین کی خدمات یاد آ گئیں۔ ان بزرگوں نے کفر کی ظلمت میں دین حنیف کے چراغ روشن کیے تھے۔ ایک روحانی کشش تھی جو آپ کو جانب چشت کھینچ رہی تھی۔ حضرت مودود چشتیؒ کا مزار اپنی طرف بلا رہا تھا۔ خواجہ ابو یوسف چشتیؒ کی قبر مبارک اپنی جانب بلا رہی تھی۔ حضرت ابو احمد ابدال چشتیؒ کی زیارت گاہ انہیں اپنی طرف آنے کا بلاوا دے رہی تھی۔ اتنی کششوں کے درمیان وہ تیزی سے چشت کی طرف جا رہے تھے۔ دل چاہتا تھا زمین کی چادر سمٹ جائے اور وہ سر کے بل چلتے ہوئے چشت پہنچ جائیں۔

راستے بھر وہ اپنے اکابرین کی حیات ہائے مبارک کے زریں واقعات دل ہی دل میں دہراتے رہے۔ دشوار ترین راہ آسان ہوگئی پتھر پھول بن گئے' گھاٹیاں' وادیاں' پہاڑ جنگل' صحرا استقبال کے لیے آنکھیں بچھاتے رہے۔

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف دمژہ کے سائے سائے

خیالات نے فرصت دی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو چشت کے درو دیوار دکھائی دیے۔ دل نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ آنکھوں نے سلام پیش کیا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس راہ میں پاؤں رکھیں یا سر۔

احتیاط لازم تھی۔ ادب کا مقام تھا' پہلے کس بزرگ کے مزار پر حاضری دی جائے۔ ایک مصروف شاہراہ پر کھڑے اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ایک خیال آیا۔ مرشد نا حضرت عثمان ہرونی کے مرشد حضرت خواجہ شریف زندنیؒ تھے اور ان کے مرشد حضرت خواجہ مودود چشتیؒ لہٰذا انصاف کا تقاضا ہے کہ پہلے خواجہ مودود چشتیؒ کے مزار پر حاضری دی جائے۔ آپ نے ایک راہ گیر سے مزار کا پتا دریافت کیا اور مجسم ادب بنے اس راہ پر ہولیے۔

مزارِ پاک پر کھڑے بہت سے لوگ دعا مانگ رہے تھے۔ وہ بھی اپنے عالم کو دنیا سے چھپائے دعا مانگنے لگے۔

جس گلی سے کبھی بادیدہ نم گزرے ہیں
اپنے عالم کو چھپائے ہوئے ہم گزرے ہیں

دعا سے فارغ ہوئے تو سجادہ نشیں حضرت احمد بن مودود چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں اس طرح گلے لگے جیسے بچھڑے ہوئے بھائی برسوں بعد ملتے ہیں۔ روح نے روح کو پہچان لیا تھا۔ صاحب سجادہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنے والا حضرت عثمان ہرونی کا مرید خاص ہے تو روح میں بالیدگی آگئی۔ "تم کوئی غیر تو ہو نہیں۔ اسی گھرانے کے فرد ہو۔ اب کہاں جاؤ گے یہیں رہو۔" فوراً قیام کا بندوبست فرمایا۔

آپ نے اپنے حجرے میں جا کر آرام کی غرض سے کمر ٹیکی ہی تھی کہ یہ محسوس ہوا کہ جیسے ماں کی آغوش میں سر رکھ دیا ہو۔ اپنائیت کا ایسا احساس ہوا جیسے اپنوں میں آگئے ہوں۔ یہ ان کا گھر ہی تو تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سماع کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ ایسی دلسوز آواز تھی کہ آپ اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا چند درویش آئے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے سماع کا بندوبست کیا گیا ہے۔ وہ محفل میں پہنچے تو قوال عاشقانہ اشعار پڑھ رہے تھے اور درویش محوِ رقص تھے۔

یہ چشت تھا' چشتیوں کا مرکز۔ سماع کی محفلیں جگہ جگہ بجتی تھیں۔ قدم قدم پر بزرگوں کے مزارات تھے۔ آپ ان مزارات پر تشریف لے جاتے اور کئی کئی دن قیام فرماتے۔ راتوں کو عبادت میں مصروف رہتے یا سماع کی کسی محفل میں تشریف لے جاتے۔

ان مشاغل میں دو سال گزر گئے۔ بزرگانِ چشت نے جھولیاں بھر بھر کے فیوض و برکات آپ پر نچھاور کیے لیکن مرشد کا حکم تھا کہ سیر و سیاحت میں دن گزارو۔ کسی ایک جگہ کا ہو جانا آپ کی تربیت میں شامل نہیں تھا لہٰذا ایک روز حضرت احمد بن مودود چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رخصتی کی اجازت طلب کی۔

"تم سے جدا ہونے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن ابھی سلوک کی بڑی منزلیں پڑی ہیں جو تمہیں طے کرنی ہیں۔ اس لیے روکوں گا نہیں۔" حضرت احمد نے کہا اور سینے سے لگا کر رخصت کیا۔

سفر پھر شروع ہوگیا۔ مختلف آبادیوں سے گزرتے ہوئے بخارا میں قدم رکھا۔ یہ ان کے لیے اجنبی شہر نہیں تھا۔ طالب علمی کے کئی سال یہاں گزارے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی کئی ہم مکتبوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے، کئی اساتذہ یاد آئے۔

آپ سیدھے اپنے استادِ محترم حضرت شیخ حسام الدین کی خدمت میں پہنچے۔ ہونہار شاگرد نے عروج کی کتنی منزلیں طے کرلی ہیں۔ دیکھا تو آنکھوں میں خوشی کے ستارے چمکنے لگے۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور مدرسے میں رہنے کا بندوبست کردیا۔

بخارا سے رختِ سفر باندھا تو سمرقند پہنچے۔ اس شہر میں بھی آپ نے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ شہر بھی ان کے ماضی کے یادوں کا حصہ تھا۔ آپ کے استاد مولانا شرف الدین اب بھی سمرقند میں مقیم تھے۔ گلیاں اور محلے آشنا تھے۔ راستے دیکھے بھالے تھے۔ بازاروں سے گزرتے ہوئے گلیوں کے چکر کاٹتے ہوئے آپ مولانا شرف الدین کے سامنے جا کھڑے ہوئے، مولانا نے ایک نظر آپ پر ڈالی اور جب پہچان لیا تو آگے بڑھ کے گلے سے لگالیا۔

خواجہ معین الدینؒ کا ارادہ یہ تھا کہ سمرقند سے فوراً نکل جائیں گے لیکن استاد نے کسی قیمت پر جانے نہیں دیا۔ انہیں مجبوراً قیام کرنا پڑا، البتہ دل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔

سمرقند میں چند دن تو آرام سے گزر گئے پھر ایک انجانی سی بے چینی محسوس ہونے لگی، ایک رات کچھ دیر کے لیے کمر

نکائی تھی کہ طائرِ خیال نے پرواز کی۔ مرشد نا حضرت عثمان ہرونی کی محفل بجی ہوئی ہے، مشائخ و اولیا موجود ہیں۔ مرشد فرما رہے ہیں 'سب تو ہیں، ہمارا معین کہاں ہے۔ مرشد کے پاس جانے کے لیے دل تڑپنے لگا۔ گھبرا کر چار پائی سے اٹھ بیٹھے، حجرے سے باہر نکلے آسمان کی طرف دیکھا' آسمان کا شامیانہ ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ستارے انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جدائی کا احساس فزوں تر گیا۔ آتش فراق سے دل جلنے لگا، کبھی سوچتے تھے کسی کو بتائے بغیر مرشد کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔ کبھی خیال آتا تھا بغیر اجازت کیسے پہنچ جاؤں۔ اذن حضوری کے بغیر پہنچ گیا تو مرشد خفا نہ ہو جائیں۔ ابھی وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ صبح کی اذان ہونے لگی۔

نماز کے بعد بھی خیالوں نے ساتھ نہ چھوڑا۔ فراغت ملی تو مرشد کی یاد نے پھر گھیر لیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ یادوں کے ہجوم نے کبھی ایسا بے کل نہیں کیا تھا۔ وہ اس یاد آوری کو بھی کسی حکمت ہی کا حصہ سمجھ رہے تھے۔ مرشد سے ملنے کی آرزو میں بھی مرشد کی مرضی شامل نہ ہو کہیں وہ مجھے بلا تو نہیں رہے ہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ساری زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ وہ بلائیں اور میں نہ جاؤں۔ وہ فوراً مولانا شرف الدین کی خدمت میں پہنچ گئے۔

''ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو جانے کا کہہ رہے ہو۔'' استاد نے محبت سے مجبور ہو کر روکنا چاہا۔

''مرشد سے ملاقات کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔''

اس جواز کے بعد استاد کا دل بھی نرم پڑ گیا۔ اجازت دینی پڑی، اسی وقت اٹھ کر چل دیے۔ مرشد حضرت عثمان ہرونی ان دنوں بغداد میں مقیم تھے لہٰذا آپ بھی سمرقند سے نکلے اور بغداد کے لیے عازمِ سفر ہو گئے۔

کئی دنوں کی مسافت کے بعد جب غبارِ سفر میں اٹے ہوئے مرشد کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا' وہ پیکر اشتیاق بنے بیٹھے ہیں اور یوں مسکرا رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ دیکھا کیسے بلا لیا اور اسی لیے بلا لیا کہ تمھیں اس سیاحت سے جو کچھ حاصل کرنا تھا کر چکے۔ اب تربیت کے کسی دوسرے راستے پر روانہ کیا جائے گا۔

آپ مرشد کے قدموں سے لپٹے ہوئے آنسو بہا رہے تھے اور مرشد تبسم فرما رہے تھے۔ ''معین الدینؒ! روتے کیوں ہو تم نے تو تمام منزلیں سر کر لیں۔''

''حضور اب اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے گا۔''

''اب جس منزل کا ارادہ ہو گا تم ساتھ ہو گے، تمہاری جدائی تو خود ہمیں بھی گوارا نہیں۔''

یہ سننا تھا کہ پورا وجود خوشی کا خزانہ بن گیا۔ مرشد خود مرید کا طالب ہو۔ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو گی۔ مرشد کا پہلو مل گیا۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہو گی۔

خدمتِ مرشد میں دن گزرنے لگے۔ عبادتوں کی لذت دو چند ہو گئی۔ ابھی اس لذت کو کشید کرتے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اعلانِ جدائی ہوا۔

''ہمارا ارادہ سفر کا ہے۔'' مرشد نے فرمایا اور کنکھیوں سے مرید خاص کی طرف دیکھا جن کے چہرے کا رنگ اس فرمان کے ساتھ ہی پیلا پڑ گیا تھا۔

''اگر تم ساتھ چلنا چاہتے ہو تو چل سکتے ہو۔'' مرشد نے دوسری سانس میں کہا حضرت خواجہ معین الدینؒ کے چہرے کا رنگ بحال ہو گیا۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ مرشد کے ساتھ ہم رکابی کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔

مرشد کو سفر پر جانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب کچھ تو مرید کی تربیت کے لیے کیا جا رہا تھا تا کہ مرشد کی معیت میں راہِ حق پر چلنا آ جائے۔

مرید کا یہ حال تھا کہ مرشد نے جس دن سے ارادۂ سفر ظاہر کیا تھا' زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ اس دن کا انتظار ہو رہا تھا جس دن سفر پر نکلا جائے گا۔ آخر وہ دن آ گیا۔ حضرت خواجہ عثمان کمرے سے باہر تشریف لائے تو حضرت خواجہ معین الدینؒ کو اس عالم میں کھڑے دیکھا کہ کندھے پر مرشد کا بستر رکھا ہے اور سر پر انگیٹھی کے اوپر توشہ دان رکھا ہے تا کہ جب مرشد کھانا طلب کریں' وہ گرم کھانا پیش کریں۔

سفر کا آغاز ہوا۔ مرشد آگے ہیں اور مرید پیچھے پیچھے ان کے نقش پر چل رہا ہے۔ ہمہ تن متوجہ ہے کہ مرشد اگر کچھ ارشاد فرمائیں تو سننے اور یاد رکھنے میں کوتاہی نہ ہو۔

آپ محسوس کر رہے تھے کہ ایک ایک قدم پر آپ کے دل میں روحانی انقلاب برپا ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کسی سفر میں ایسا حال نہیں ہوا تھا۔ مرشد اقوال سے نواز رہے ہیں حکایات سنا رہے ہیں علم و معرفت کا سمندر موجزن ہے۔ سفر کیا ہے چلتا پھرتا مکتب ہے۔

اس دور کی قافلے کا رخ مضافات بغداد کی طرف تھا جہاں انہیں اوش نامی شہر میں پہنچنا تھا۔ حضرت عثمان ہرونی نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اوش میں بہاء الدین بختیار اوشی کی خانقاہ میں قیام کریں گے۔ چنانچہ اوش پہنچتے ہی اس خانقاہ کا رخ کیا۔ حضرت بہاء الدین نہایت تپاک سے ملے اور دونوں بزرگ گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ خواجہ معین الدینؒ کسی شاگرد کی طرح خاموش بیٹھے تھے لیکن گفتگو کا ایک ایک لفظ

کتابِ دل میں محفوظ کرتے جا رہے تھے۔ آپ سمجھ گئے تھے کہ یہ سب باتیں مجھے تعلیم دینے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ انہی اقوالِ صادق کو انہیں آئندہ عملی زندگی میں بروئے کار لانا ہے۔

اس خانقاہ میں جب تک قیام رہا' باتوں کی بھیڑ لگتی رہی۔ دونوں بزرگ اپنے اپنے تجربات ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ مقصود یہی تھا کہ ساتھ آنے والا شاگرد ان تجربات کو حفظ کر لے۔

اوش کے بعد اگلی منزل بدخشاں تھی۔ یہاں پہنچ کر ایک مسجد میں قیام کیا۔

''تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔ ایک وقت وہ تھا جب میں سلوک کے مراحل طے کرتا ہوا اپنے مرشد کے ساتھ بدخشاں آیا تھا۔ آج میں مرشد ہوں اور تم میرے ساتھ آئے ہو۔ جن مقامات سے میں گزرا تھا۔ آج تمہیں وہاں سے گزار رہا ہوں۔ چراغ سے چراغ اسی طرح روشن ہوتے ہیں۔''

حضرت عثمان ہرونی نے فرمایا۔

کئی دنوں بعد یہ دونوں بزرگ دمشق پہنچے۔ دمشق اور اس کے مضافات میں ہزاروں کی تعداد میں انبیاء کرام کے مقدس مزارات تھے۔ لاتعداد اولیا اللہ یہاں آسودۂ خواب تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عثمان ہرونی کے مرشد حضرت خواجہ شریف زندنیؒ بھی اس خاک میں سو رہے تھے۔ ان پاکیزہ ہستیوں کی زیارت کیے بغیر کیسے آگے بڑھ سکتے تھے۔

سب سے پہلے حضرت شریف زندنیؒ کے مزار پر حاضری دی اور کئی دن وہاں بسر کیے۔ پھر مزاروں کی زیارت کا سلسلہ طول پکڑتا رہا۔ مدت قیام خاصی طویل ہو گئی۔ اس قیام نے آپ کو جن حقائق' مقامات' احوال اور درجات سے گزارا وہ کم نہیں تھا۔ لیکن سچ ہے معرفتِ الٰہیہ کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر پرواز کے بعد ایک اور پرواز کی تیاری ہوتی ہے۔ مرشد نے اپنے مرید کے پروں کی طاقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''معین الدینؒ! کل انشاء اللہ روانہ ہوں گے۔''

''جیسا آپ کا حکم۔''

عشا کی اذان ہوئی۔ دونوں بزرگ اٹھ کر جانبِ مسجد چل پڑے۔ نماز پڑھ کر قیام گاہ پر واپس آئے تو حضرت خواجہ معین الدینؒ کے دل میں خیال آیا کہ مرشد نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اگلی منزل کون سی ہو گی۔ پوچھنے کی ہمت تو تھی نہیں راضی بہ رضا ہو کر چپ ہو گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اگلی منزل سب منزلوں کی منزل ہے۔ مرشد نے ان کے لیے کیسی حسین منزل کا انتخاب کیا ہے اور وہاں سے کیسے کیسے انعامات ملنے والے ہیں۔ یہ بھید تو اس وقت ظاہر ہوا جب وہ مرشد کی ہمراہی میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ پورے وجود میں لرزہ طاری تھا۔ یہ مرشد مجھے کس امتحان گاہ میں لے آئے۔ بات اب سمجھ میں آگئی۔ ان مراحل سے گزارنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہاں تک لانا مقصود تھا۔

جب خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے تو ہیبت و جلال سے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ مرشد نے سہارا دینے کے لیے آپ کا ہاتھ پکڑا اور خانۂ کعبہ کے پرنالے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اپنے رب کی مناجات کی اور عرض کیا۔

''اے بارِ الٰہ! معین الدینؒ میرا مرید ہے۔ اس کو تیرے پیارے حبیب ﷺ کا فیض پہنچایا ہے تو اسے قبول فرما۔''

ابھی یہ دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ندا آئی ''ہم نے معین الدینؒ کو قبول کیا۔''

''معین الدین! اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس قبولیت پر مبارک ہو۔'' مرشد نے فرمایا۔

''حضور' یہ آپ کی نظر و دعا کا فیض ہے ورنہ میری کیا حیثیت ہے۔''

قبولیت کا حکم اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ خوشی سے دل جھوم رہا تھا۔ اتنی بڑی خوش خبری سننے کے بعد دنیا میں دل کس کا لگ سکتا ہے۔ دنیا اتنی حقیر نظر آنے لگی کہ مرشد کی خدمت اور اللہ کی عبادت کے سوا کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ دن کو روزہ رکھتے شب کو عبادت کرتے۔ یہی اس شہر کا استقبال تھا۔ ریاضت و مجاہدہ عجیب تھا۔ سات روز کے بعد روٹی کے کناروں سے، جن کی مقدار پانچ مثقال سے زیادہ نہ ہوتی' پانی میں بھگو کر افطار کرتے۔ لباس پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے۔ نظریں زمین پر دل عرشِ معلیٰ پر۔

اسی عالم میں دن پر دن گزرتے گئے۔ کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کے شہر مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ مقام ادب تھا۔ اولیائے کرام یہاں ادب سے اونچا سانس نہیں لیتے۔ امام مالک یہاں کی گلی کوچوں کے کنارے کنارے ننگے پاؤں چلتے تھے کہ کہیں ان کا پاؤں حضورؐ کے قدم مبارک پر نہ آ جائے۔ جہاں ہر روز ستر ہزار ملائکہ سلامی کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ ایسے شہر کا سفر تھا کہ رعب محبت سے بدن کانپ رہا تھا۔ ہر ہر قدم پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہ وہ بارگاہ تھی کہ جہاں مرشد و مرید دونوں برابر تھے۔ دونوں کا ایک عالم تھا۔ دور سے سبز گنبد نظر آیا تو آنکھوں سے آنسو رواں

ہوگئے۔ دل دھڑکنا بھول گیا۔ پاؤں رکھتے تھے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ مسجد نبویؐ کے اندر داخل ہوئے تو سیدھے روضۂ اقدس کی طرف گئے، سر خود بخود جھک گیا۔ ہاتھ ادب سے بندھ گئے۔ ایسی بارگاہ میں تھے کہ لب کشائی کی ہمت نہیں تھی۔

''معین الدینؒ! بارگاہِ رسالت مآبؐ میں نذرانہ عقیدت اور صلوٰۃ وسلام کا ہدیہ پیش کرو۔''

حضرت خواجہ معین الدینؒ کو جیسے ہوش آ گیا ''الصلوٰۃ والسلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ ﷺ''

اس عاجزانہ سلام کے الفاظ مکمل ہوئے تھے کہ روضۂ پاک کے اندر سے آواز آئی ''وعلیکم السلام یا قطب المشائخ بَرّ و بحر۔''

''بس تمہارا کام بن گیا۔'' مرشدنا حضرت عثمان ہرونی نے مبارکباد دی۔

خواجہ معین الدینؒ کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔ عنایات وکرم کی بارش ہو رہی تھی۔ عطا ہی عطا تھی۔ رحمت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اتنا تھا کہ ایک دن میں سمٹ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن کیا عمر خضر بھی کم تھی۔ جی چاہتا تھا کہ یہ عمر مختصر یہیں بیت جائے۔ لیکن دینے والے نے بھی کمال کیا۔ ایک مٹھی میں سب کچھ بخش دیا، مشائخ بَرّ و بحر کی سند عطا فرمادی۔

سبز گنبد، سنہری جالیوں سے الگ ہونے کا خیال آتا تھا تو روح بغاوت پر تل جاتی تھی۔ چند یوم اسی حالت میں گزر گئے۔ پھر کسی ذات شفقت آمیز نے دلِ مضطرب پر تسلی کا ہاتھ رکھ دیا۔ صبر آ گیا مرشد کے قدم اٹھ چکے تھے۔ ابھی کوئی امتحان اور باقی تھا۔ چشم نم کے ساتھ رخصت کی اجازت طلب کی۔ سنہری جالی کو بوسہ دیا اور مرشد کی معیت میں مسجدِ نبویؐ سے باہر نکل آئے۔

اب ان کے مرشد انہیں جس امتحان سے گزارنا چاہتے تھے، اس سے بڑا امتحان اور کوئی نہیں۔ وہ مرشد کے بستر کو کندھے پر اٹھائے اور سر پر انگیٹھی رکھے، منزل سے ناآشنا، نظریں جھکائے چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے مغرب کا وقت ہوگیا، دور تک ویرانہ تھا کوئی بستی نہ کوئی مسجد۔ مرشد کی امامت میں انہوں نے اسی ویرانے میں نماز عشا ادا کی۔ چودھویں کا چاند ان پاکیزہ ہستیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے اسی ویرانے میں ٹھہر گیا تھا۔ ہر طرف نور کی چادر بچھ گئی تھی۔

صبح نمودار ہوئی۔ چاند نے اپنی سلطنت سورج کے حوالے کی تو یہ مسافر بھی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے، کئی دنوں کی مسافت کے بعد مرشد نے اس راستے پر قدم رکھے جو سیستان کو جاتا تھا۔ اسی صوبے کے ایک چھوٹے سے قصبے میں حضرت خواجہ معین الدینؒ کی ولادت ہوئی تھی۔ بہن بھائی اسی سرزمین پر آباد تھے۔ بچپن یہیں گزرا تھا۔ بچپن کے ساتھی ابھی تک یہاں آباد ہوں گے۔

وہ گھر یہیں تھا جس کے آنگن میں ان کا بچپن کھیلا تھا۔ ماں جیسی ہستی بھی یہیں دفن تھی۔ ایک ایک ذرے میں یادوں کا رین بسیرا تھا۔

مرشد نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ عارضی وطن کے لیے دل تڑپتا ہے یا اصلی وطن پر نگاہ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت نے سب محبتوں کو دل سے نوچ کر پھینک دیا ہے یا نہیں۔ دنیا کی محبت دل میں گھر کیے ہوئے ہے یا ہر طرف سے بے نیاز ہوکر ''ایک'' محبت نے دل میں گھر بنالیا ہے۔ اپنی ہر خواہش کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے یا نہیں؟ تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا سونا تپ کر کندن بن چکا؟

ایک جگہ ڈیرے ڈالے گئے، مرشد بار بار مرید کی طرف دیکھ لیتے تھے کہ چہرے کا رنگ وہی ہے یا بدل گیا؟ کسی محبت نے کوئی جلوہ گری نہیں کی۔ کسی یاد نے دل کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ ماضی کا کوئی نقش ابھر کر نمایاں نہ ہوا۔ خواجہ معین الدینؒ اس طرح مطمئن بیٹھے تھے جیسے کسی اجنبی بستی میں قیام پزیر ہوں۔ مرشد نے جب یہ حال تماشا کیا تو تربیت کی تکمیل کا یقین آ گیا۔

''معین الدینؒ!''

''یا مرشد''

''چلو اب چلتے ہیں۔''

خواجہ معین الدینؒ نے مرشد کا بستر کندھے پر رکھا۔ انگیٹھی سر پر دھری اور نقشِ قدم کی پیروی میں قدم بڑھا دیے۔ یہ پوچھنا خلاف ادب تھا کہ اب ارادہ کدھر کا ہے۔

جب مرشد نے بغداد کے راستے پر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ واپسی قریب ہے، یہ واپسی آٹھ سال مسلسل سفر میں رہنے کے بعد ہو رہی تھی، بغداد میں مریدین اور عقیدت مندوں کی آنکھیں راہ تک رہی تھیں۔ جیسے ہی واپسی کا غلغلہ بلند ہوا زیارت و ملاقات کرنے والوں کا ہجوم ہوگیا۔ سب خاموش مؤدب بیٹھے تھے، چاہتے سب یہی تھے کہ سفر کے حالات سے آگاہی ہو لیکن بولنا خلاف ادب تھا جب تک کہ حضرت عثمان ہرونی از خود ان رازوں کو آشکار نہ فرمائیں۔

حضرت عثمان ہرونی نے دلوں کے سوالوں کو پڑھ کر جواب کے لیے لب کشائی کی ''معین الدینؒ اللہ تعالیٰ کا مقبول

نبی کریم ﷺ کا سند یافتہ ہے اور ہم اس کی مریدی پر فخر کرتے ہیں۔"

اس مرید کا کیا کہنا جس پر خود مرشد فخر کرے۔ حاضرین نے رشک آمیز نظروں سے خواجہ معین الدینؒ کی طرف دیکھا۔ کئی آنکھیں ایک ساتھ آپ کی بزرگی کا جائزہ لینے کے لیے اٹھیں۔ خواجہ سنجری سر جھکائے ادب سے دوزانو بیٹھے تھے۔

ابھی کلمات تحسین اور مبارک باد کا شور کم نہیں ہوا تھا کہ حضرت خواجہ عثمان ہرونی کی آواز ابھری "ہم کچھ عرصے کے لیے معتکف ہونا چاہتے ہیں۔"

آپ نے ایک نظر اپنے چہیتے مرید کی طرف دیکھا اور فرمایا "تم چاشت کی وقت آجایا کرو تا کہ مزید علم و معرفت عطا کروں۔" پھر حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

"اگر تم میں سے بھی کوئی آنا چاہے تو دروازے کھلے ہیں البتہ میرے معتکف ہونے کے بعد میری نیابت کے فرائض معین الدینؒ انجام دیں گے۔"

یہ چوتھی منزل تھی جس سے آپ کے مرشد آپ کو گزار رہے تھے۔ دیکھنا تھا کہ وہ حاضرین سے کیا سلوک روا رکھتے ہیں، عام لوگوں کی دلگیری کس طرح کرتے ہیں، مشکل میں گھرے افراد کی دست گیری کس طرح کرتے ہیں، جو انعامات تقسیم ہوئے ہیں انہیں کس طرح تقسیم کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس مصروفیت کے باوجود ریاضت و عبادات کا حق کس حد تک ادا کرتے ہیں۔

حضرت عثمان ہرونی اعتکاف میں چلے گئے اور نیابت کا بار عظیم حضرت خواجہ معین الدینؒ کو اٹھانا پڑا۔ آپ خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے لیکن مرشد کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ حضرت خواجہ نے خانقاہ کے تمام معاملات خوش اسلوبی سے انجام دینے شروع کر دیئے۔ حضرت عثمان ہرونیؒ کی مجلس کے شرکاء حضرت خواجہ معین الدینؒ کے اخلاق کریمانہ کے معترف ہوگئے۔

مرشد کا حکم تھا کہ تم (حضرت خواجہ معین الدینؒ) چاشت کے وقت آجایا کرو۔ دوسرے حاضرین کو بھی یہی حکم تھا۔ جب چاشت کا وقت ہوتا آپ اپنے مرشد کے پاس تشریف لے جاتے۔ اور لوگ بھی آجاتے تھے۔ جب سب جمع ہو جاتے تو حضرت عثمان ہرونی لب کشائی فرماتے اور علم و معرفت کے موتی لٹانے لگتے۔ ان محافل کا انتظام دراصل حضرت خواجہ معین الدینؒ کی تربیت کے لیے ہی کیا گیا تھا۔ مرشد معتکف ہو کر بھی مرید سے غافل نہیں تھے۔

اٹھائیس مجالس منعقد ہو چکی تھیں کہ ایک محفل کے اختتام پر حضرت عثمان ہرونی نے خواجہ معین الدینؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے معین الدینؒ! میں نے تیری کمالیت کے لیے ان باتوں کی ترغیب دی ہے۔ پس چاہئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے تو دل و جان سے انہیں بجالائے تا کہ قیامت کو شرمندہ نہ ہو۔ لائق فرزند وہ ہے کہ جو کچھ اپنے پیر کی زبان سے سنے تو ہوش کے کانوں سے سنے۔ اور اس میں مشغول ہو جائے اور اسے بجالائے۔"

یہاں تک پہنچ کر آپ خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر آنکھیں کھولیں اور عصا جو پاس پڑا تھا۔ اٹھا کر حضرت خواجہ معین الدینؒ کو عطا فرمایا۔ اس کے بعد خرقہ اور لکڑی کی پاپوش (کھڑاویں) اور ایک مصلیٰ مرحمت فرمایا۔

"یہ تمام چیزیں ہمارے پیروں کی یادگاریں ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ہم نے تجھے دیں مناسب ہے کہ جیسا ہم نے ان چیزوں کو رکھا ویسا ہی تو بھی رکھے اور جس شخص کو تو مرد خدا معلوم کرے اسے دے دے۔"

جب یہ فرما چکے تو حضرت خواجہ معین الدینؒ سے بغل گیر ہو کر فرمایا "تجھے خدا کو سونپا۔" ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ آپ سمجھ گئے کہ مرشد سے جدائی کا وقت قریب آگیا ہے۔ تمام پیر بھائی جو اس وقت موجود تھے اٹھ اٹھ کر آپ سے مصافحہ کر رہے تھے، مبارکباد دے رہے تھے۔ آپ کا یہ حال کہ دل پر قابو پانا مشکل تھا۔ مرشد کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد آرہا تھا۔ نورانی محفلوں کی یاد آرہی تھی۔ کیا خبر مرشد سے زندگی میں دوبارہ ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں۔

آرزو کچھ بھی ہو مرشد کی بات ٹالی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ مرشد سے معانقہ کیا، قدم بوسی کا شرف حاصل کیا اور بغداد سے روانہ ہو گئے۔ حضرت شیخ اوحد الدین کرمانی اور چند دوسرے افراد بھی آپ کے ہمراہ ہو گئے۔

معرفت کی جو دولت نصیب ہوئی تھی، اس کا خانہ کعبہ میں حاضر ہو کر شکر بھی بجالانا تھا۔ اور ثابت قدمی کے لیے دعا بھی فرمائی تھی۔ آپ نے کچھ دن کرمان میں گزارے۔ یہیں حضرت قطب الدین اوشی آپ کے مرید ہوئے۔ چند اور افراد بھی آپ کے جمال ولایت اور رنگ فقر کو دیکھ کر آپ کے ہمراہ ہو گئے۔ تیس چالیس افراد کا یہ قافلہ حرم کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

"اے اللہ! تیرا شکر بجالاتا ہوں کہ تو نے مجھے اپنے مقبول بندوں میں شمار کیا، مجھے توفیق دے کہ میں تیری مخلوق کی

خدمت و رہنمائی میں سرگرم عمل رہوں۔ مجھ سے دین اسلام کی سربلندی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہو۔''

مکہ مکرمہ پہنچتے ہی یہ کلمات آپ کے ہونٹوں پر جاری ہوگئے۔ طوافِ کعبہ کرتے اور عبادت میں مشغول ہوتے تو اس کے سوا کوئی دعا ہونٹوں پر نہ آتی۔ آخر ایک روز سننے والے نے یہ صدا سن لی۔ کہنے والا کہہ رہا تھا۔

''اے معین الدینؒ! ہم تجھ سے خوش ہیں' تجھے بخش دیا مانگ کیا مانگتا ہے تا کہ عطا کروں۔''

یہ سنتے ہی سر نیاز زمین پر رکھ دیا اور بصد عجز و انکسار عرض کیا' بارِ الٰہ! معین الدینؒ کے مریدان سلسلہ کو بخش دے۔''

آواز آئی ''اے معین الدینؒ! تو ہماری مِلک ہے' جو تیرے مرید اور تیرے سلسلے میں تا قیامت مرید ہوں گے' انہیں بخش دوں گا۔''

انہی دنوں حج کا موسم آگیا۔ بہار آگئی۔ ہر طرف سفید احراموں کے پھول کھل گئے' آپ نے بھی یہ فریضہ انجام دیا اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

مکہ مکرمہ میں اگر رعب و جلال تھا تو یہاں محبتیں تھیں۔ نرمی ہی نرمی شفقت ہی شفقت تھی' ہر سو رحمتیں برستی تھیں۔ روضۂ پاک پر حاضری دی گلدستہ سلام نذر کیا اور پھر مسجد قبا میں معتکف ہوکر ریاضت و عبادت میں مشغول ہوگئے۔

وصال کے شب و روز طویل ہوتے چلے گئے۔ چھ ماہ گزر گئے ایک رات کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹے تھے کہ نیند آگئی لیکن مقدر بیدار ہوگیا۔ خواب میں دیکھا کہ رحمۃ للعالمینؐ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔

''اے معین الدینؒ۔ تم معین دین ہو' تمہیں ہندوستان کی ولایت دی جاتی ہے۔ اجمیر کو اپنا مستقر بناؤ۔''

آنکھ کھلی تو حضور اکرمؐ کی تشریف آوری کی خوشی میں آنسو رخساروں کا وضو کرنے لگے۔ پھر خواب کا خیال آیا تو الجھن میں پڑ گئے۔ اجمیر کا تو نام ہی میں نے پہلی بار سنا ہے۔ یہ کہاں ہے کس طرف ہے۔ میں وہاں تک پہنچوں گا کیسے۔ سوچتے سوچتے پھر غنودگی آگئی۔ دربار پھر سج گیا۔ عالم خواب میں اجمیر اور اس کا راستہ دکھا دیا گیا۔

خواب سے بیدار ہوئے تو روضۂ اقدس پر حاضری دی اور پھر اپنے احباب کے ہمراہ بغداد کی طرف چل پڑے تاکہ اس کامیابی سے مرشد کو باخبر کرسکیں اور ان سے اجازت لے کر ہندوستان کا قصد کریں۔

☆☆☆

اجمیر کے کفرستان میں راجا پرتھوی راج کے محل میں بہت سے نجومی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ انکے چہروں پر تشویش اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ کئی ایک کے ماتھے پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ وہ بڑی دیر سے ستاروں کا حساب لگانے میں مصروف تھے۔ ایک زائچہ بناتے' اسے غور سے دیکھتے' پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے آنکھوں آنکھوں میں کچھ باتیں ہوتیں اور از سر نو زائچہ بنانے لگتے کہ شاید ستاروں کی چال سمجھنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو۔ ہر مرتبہ ایک ہی جواب آرہا تھا، اور وہ جواب ایسا نہیں تھا کہ راجا کی ماں کو بتایا جاسکتا جو ان پنڈتوں کے چہروں کی لکیروں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے تم لوگ کس بات پر پریشان ہو رہے ہو' کیا کہتے ہیں ستارے؟'' راج ماتا نے تنگ آکر پوچھا۔

''رانی ماں! خبر اچھی نہیں ہے۔ ابھی روشنی ہے مگر جلد ہی اندھیرا پھیل جائے گا۔'' ایک نجومی نے ہمت کر کے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا' کس اندھیرے کی بات کر رہے ہو' میرے بیٹے کی حکومت دہلی سے پٹیالہ تک پھیلی ہوئی ہے اس کی قسمت میں اندھیرا کیسا؟''

''رانی ماں! ستارے تو یہی کہتے ہیں۔''

''صاف صاف بتاؤ کہ کیا کہتے ہیں ستارے۔''

''ایک شخص غیر دیس سے آئے گا اور آپ کے سپوت پرتھوی راج کی سلطنت برباد کر دے گا۔''

''میں تم سب کو ہاتھی کے پاؤں تلے ڈلوا دوں گی۔ کیا بکواس کرتے ہو۔ کس میں ہمت ہے جو پرتھوی راج کو نیچا دکھائے۔'' رانی ماں غصے سے تن کر کھڑی ہوگئی۔

تمام نجومی تھر تھر کانپ رہے تھے آخر ایک نے ہمت کر کے کہا' ستارے تو یہی کہتے ہیں۔ کئی مرتبہ حساب لگا کر دیکھ لیا۔''

''آنے والا کوئی بادشاہ ہے؟'' رانی ماں کی آواز میں شکست نمایاں تھی۔

''نہیں' وہ کوئی درویش ہوگا جس کے ساتھ چند لوگ اور بھی ہوں گے۔''

''حساب کتاب لگا کر اس کے بارے میں مجھے کچھ اور بتاؤ۔''

''ہم پہلے ہی سب حساب کتاب لگا چکے ہیں۔ اس کے حلیے کے بارے میں جانکاری ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر داڑھی ہوگی۔ چوڑی پیشانی ہوگی شانے چوڑے ہوں گے۔ آنکھوں میں چمک ہوگی۔ ہونٹوں پر مسکان' قد لمبا ہوگا۔ بہت دبلا پتلا ہوگا۔''

''کیا اس بلا کو ٹالا جاسکتا ہے۔ اس کا کوئی اپائے ہے

تمہارے پاس؟"

"ہم پوجا پاٹ کرلیں گے پرنتو راجا کے بھاگوں میں یہی لکھا ہے۔ کل کو ستارے اپنا گھر بدل لیں تو الگ بات ہے۔"

اس کے بعد پوچھنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ نجومی ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے اور راج ماں گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ نجومی اگر ٹھیک کہتے ہیں تو اب کیا ہوگا۔ پرتھوی کے اس دشمن سے کیسے نجات پائی جائے۔

پرتھوی راج اجمیر سے باہر گیا ہوا تھا اور وہ اکیلی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ بیٹے کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ یہ انتظار طول پکڑ گیا تو اسے ہول اٹھنے لگے۔ کہیں اسکے آنے سے پہلے ہی اس کا دشمن یہاں نہ پہنچ جائے۔ ایک ایک دن کا گزرنا دوبھر ہوگیا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ بیٹے کی محبت اسے مجبور کررہی تھی کہ وہ اس کی فکر میں گھلتی رہے۔

ایک دن راج محل میں شور مچا۔ پرتھوی راج سفر سے واپس آگیا تھا۔ رانی ماں نے فوراً اسے پیغام بھجوایا اور وہ دوڑا چلا آیا۔ ابھی سفر کے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے تھے کہ ماں کے سامنے پہنچ گیا۔ ماں کا کمہلایا ہوا چہرہ دیکھ کر فکر مند ہوگیا۔

"ماں یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"بڑی منحوس خبر ہے بیٹا۔" ماں نے کہا اور پھر نجومیوں نے جو پیش گوئیاں کی تھیں پرتھوی راج کو تفصیل سے بتادیں بات ایسی تھی کہ وہ بھی فکرمند ہوگیا لیکن اپنی گھبراہٹ رانی ماں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا اس نے اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے ماں کو تسلی دی۔

"ماں پریشانی کی کوئی بات نہیں' میں سب انتظام کرلوں گا۔"

راجا کئی دنوں تک اس مصیبت سے نمٹنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ دربار کے عقل مندوں سے مشورے کرتا رہا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نجومیوں کے بتائے حلیے کے مطابق تصویر بنائی جائے اور اسے مختلف شہروں میں چسپاں کر دیا جائے۔ اس کے حکم کے مطابق اس حلیے کی تصویریں جگہ جگہ لگا دی گئیں۔ ساتھ ہی اس نے اعلان کر دیا کہ یہ شخص ہندو دھرم کا دشمن ہے لہٰذا اس شکل کا آدمی سفر کرتا ہوا پایا جائے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ کام اس نے صرف شہریوں پر نہیں چھوڑا بلکہ مختلف قصبات میں اپنے ملازم بھی متعین کر دیئے جو ادھر ادھر گھوم پھر کر اس حلیے کے آدمی کو تلاش کرنے لگے۔

تمام انتظامات حسب منشا ہوگئے تھے۔ راجا مطمئن بھی ہوگیا تھا لیکن ایک پھانس تھی جو اٹکی ہوئی تھی۔ اطمینان کے باوجود وہ بے چین رہنے لگا۔ جب زیادہ پریشان ہوجاتا تو نجومیوں کو بلالیتا۔ نجومی ہر مرتبہ وہی جواب دیتے۔ راجا کے سپاہی نگر نگر مسجدوں اور خانقاہوں میں اس مسلمان مسافر کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

☆☆☆

حضرت خواجہ معین الدینؒ تیزی سے بغداد کی طرف جارہے تھے۔ آپ کے ساتھی اس جلد بازی پر حیران ہورہے تھے۔ ایسی عجلت ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھی لیکن اب کچھ بات ہی ایسی تھی۔ وہ جلد از جلد مرشد کی خدمت میں پہنچ کر یہ خوشخبری سنانے کے لیے بے چین ہوگئے تھے۔

قدموں نے بغداد کی زمین پکڑی۔ انہوں نے ساتھیوں کو خیر باد کہا اور خود حضرت عثمان ہرونی کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوئے۔ قدم بوسی کے بعد مرشد کو اس خواب سے آگاہ کیا جو انہوں نے مدینہ منورہ میں ملاحظہ کیا تھا۔ مرشد نے ساعت فرمایا تو خوش ہوئے۔

"ان الطاف وعنایات کا تقاضا ہے کہ زکوٰۃ دو" مرشد نے قدرے سکوت کے بعد فرمایا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی جو اس وقت موجود تھے' حضرت خواجہ معین الدینؒ نے انہیں سینے سے لگایا' بے شمار انعامات سے نوازا اور بیعت وخلافت سے مشرف کیا۔ یہی ان کی زکوٰۃ تھی۔

حضرت خواجہ عثمان ہرونی اکثر گوشۂ تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت وذکر میں مشغول رہتے تھے۔ اب خواجہ معین الدینؒ تشریف لے آئے تو انہوں نے اپنے بہت سے کام آپ کے سپرد کردیئے۔ اگر کوئی حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی درخواست کرتا تو خنداں بہ لب ارشاد فرماتے "معین الدینؒ کے پاس جاؤ۔" مقصد یہ تھا کہ مریدین میں اضافہ ہوجائے اور ہندوستان جانے سے پہلے ان کا اعتماد بحال ہوجائے۔

اس اجازت کا ملنا تھا کہ لوگ دور ونزدیک سے حاضرِ خدمت ہونے لگے اور دست حق پرست پر بیعت کرنے لگے۔ عام لوگ بھی دستگیری و رہنمائی کے لیے ان کے پاس آنے لگے۔ بغداد میں ہر طرف ان کی جلالت وعظمت کے چرچے ہونے لگے۔

ایک روز حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے بعض مریدوں اور پیر بھائیوں کے ساتھ کسی جگہ تشریف فرما تھے اور ذکر انبیا علیہ السلام کا ہورہا تھا کہ بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا ہاتھ میں پیالہ لے کر ادھر سے گزرا۔ سب بزرگوں کی نظر اس پر پڑی۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔ ''یہ لڑکا جب تک دہلی کا بادشاہ نہ ہوگا' اللہ اسے دنیا سے نہیں اٹھائے گا۔''

یہ لڑکا شمس الدین التمش تھا جو واقعی دہلی کا بادشاہ بنا۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ تھے جن کی اللہ نے لاج رکھی یا اس کی قسمت تھی جسے خواجہ معین الدینؒ نے پڑھ لیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کے مریدوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فرمانِ رسولؐ کے مطابق اجمیر جاکر آپ کو اسلام کا پرچم بلند کرنا تھا لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد یہاں کے مریدین و معتقدین کی تربیت ہوجائے۔ اس کے لیے انہوں نے مجالس کا انعقاد کیا۔ وقتاً وقتاً تربیتی مجالس منعقد ہونے لگیں جن میں مختلف موضوعات پر آپ گفتگو فرماتے۔

اس قسم کی گیارہ مجالس منعقد ہوئی تھیں کہ آپ نے اجمیر کی طرف روانہ ہونے کا اعلان کردیا۔ حضرت قطب الدین بختیار اوشی تو خیر آپ کے قدموں سے جدا ہوتے ہی نہیں تھے۔ انہیں تو شرفِ ہمرکابی سے مشرف ہونا ہی تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی مریدوں نے اذنِ ہمرکابی طلب کیا۔ آخر ان پاکیزہ نفوس کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی۔

جب یہ چھوٹا سا کارواں چلنے لگا تو حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے عطا کردہ تبرکات خواجہ بختیار اوشی کے سر مبارک پر تھے۔ میرِ کارواں حضرت خواجہ معین الدینؒ نے قرآن پاک کو اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ مختلف لوگوں نے مختلف سامان سروں اور کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ اسی وقت حضرت عثمان ہرونی تشریف لے آئے۔

''معین الدینؒ! ہم تمہیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہیں شاید پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔''

ان الفاظ میں ایسی تاثیر تھی کہ پورا ماحول سوگوار ہوگیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جس میں آنسو نہ ہوں۔ برسوں کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ یقین تھا کہ اب ملاقات نہ ہوگی۔ اب واپسی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

گھر سے نکلے ہیں آنسوؤں کی طرح
واپسی کا کوئی سوال نہیں

حضرت عثمان ہرونی الوداع کہنے کے لیے قافلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے سب خاموش سر جھکائے چل رہے تھے۔ جب قافلہ اس راستے پر پہنچا جو سبزوار کی طرف جاتا تھا تو آپ رک گئے۔ سب کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دعا فرمائی اور واپس لوٹ گئے۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ مڑ مڑ کر مرشد کو دیکھتے رہے اور پھر سبزوار کی طرف چل پڑے۔

قافلہ منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ رہبرِ کارواں نے ویرانوں اور جنگلوں کے بجائے ایسے راستے کا انتخاب کیا جو بستیوں قصبوں اور باغوں سے ہوکر گزرتا تھا۔ کیونکہ یہ سفر ریاضت اور مجاہدے کے لیے نہیں تھا تلقین و وعظ کے لیے تھا۔ وہ باغوں اور شہروں میں ڈیرے ڈالتے تاکہ مخلوقِ خدا میں انعامات تقسیم کریں۔ جس طرف سے گزریں' مسلمانوں کو سیدھی راہ دکھائیں۔ رشد و ہدایت کے چراغ روشن کریں' علم و حکمت کے موتی نچھاور کریں۔

یہ قافلہ جب کسی بستی سے گزرتا دیکھنے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے۔ ان لوگوں کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے جو گھر بار' عزیز و اقارب کو چھوڑ کر دیارِ کفر و شرک میں اللہ کے دین کا پرچم بلند کرنے جارہے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ ان جمع ہونے والے لوگوں سے خطاب کرتے' اپنے استقبال کرنے والوں پر نصیحتوں کے پھول نچھاور کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ سیکڑوں دلوں میں حق کے چراغ جلادیے' بنجر ذہنوں کو شاداب کردیا' مایوس دلوں کو پرامید کردیا۔

یہ قافلہ سبزوار' ہرات' بلخ اور غزنین سے ہوتا ہوا ملتان پہنچ گیا۔ راستے میں جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے اعلان فرمایا کہ وہ یہیں قیام فرمائیں گے۔ ملتان سے آگے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوجاتی تھی۔ گویا آپ اس دروازے پر آکر رک گئے جہاں سے آگے آپ کے مشن کا آغاز ہونا تھا۔

یہاں قیام کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ اجمیر کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندی زبان بھی سیکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ یہاں کے لوگوں سے ابلاغ ممکن ہوسکے۔ ملتان اولیا کی سرزمین ہے۔ لاتعداد مزارات قدم قدم پر جلوہ افروز ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ان مزارات پر حاضری اور فیوض و برکات کا حصول بھی ضروری تھا۔

آپ کو ملتان میں قیام کیے ہوئے دو ڈھائی ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے اپنے ماموں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا وہ فقرہ یاد آگیا جو انہوں نے ایک دن آپ سے فرمایا تھا۔

''اے معین الدینؒ! ہند کی سرحد پر ایک شیر بیٹھا ہے' اس سے ڈرنا۔''

بعد میں اس فقرے کی وضاحت بھی فرمادی تھی۔ ان کی مراد حضرت علی بن عثمان داتا گنج بخش ہجویریؒ سے تھی جن کا مزار لاہور میں تھا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ غزنیں میں پیدا ہوئے۔ علم کی تشنگی بجھانے کے لیے دور دراز کے علاقوں میں تشریف لے گئے تین صد مشائخ و اولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علم و حکمت کے موتیوں سے دامن بھرا۔ والدین کی تربیت' نامور اساتذہ کی تعلیمات اور مرشد کی قربت و تربیت نے انعامات سے نوازا۔ بعد از اں مرشد کے فرمان کے مطابق ہندوستان کا رخ کیا۔ دورانِ سفر جہاں قیام فرماتے تبلیغ حق کرتے۔ نورِ ہدایت کے چراغ روشن کرتے ہوئے 431 ہجری میں وارد لاہور ہوئے۔ یہاں تک کہ 465 ہجری کو اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کے وصال کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہوا تھا کہ اللہ کا ایک اور ولی ملتان میں بیٹھ کر انہیں یاد کر رہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے مریدوں پر اجمیر روانگی کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے کہ اچانک یہ فقرہ یاد آ گیا ''ہند کی سرحد پر ایک شیر بیٹھا ہے اس سے ڈرنا۔''

آپ نے اجمیر جانے کے بجائے اپنے مریدوں کے ہمراہ لاہور کا رخ کیا اور داتا کے مزارِ اقدس پر پہنچ گئے۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھ گئے کافی دیر تک کیا خبر کیا کچھ مانگتے رہے۔

اب اس شیر کو منائے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے پاؤں کی جانب ایک حجرہ مبارک سا بنا لیا اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ نماز فجر کے بعد قرآن پاک کی تلاوت اس لحن سے فرماتے کہ در و دیوار جھوم اٹھتے۔ اسی حال میں آٹھ نو ماہ گزر گئے۔ قبر مبارک سے کوئی آواز نہ آئی۔ کوئی نشانی ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حاضری قبول ہو گئی ہے۔ آپ چالیس روز کے لیے چلے میں بیٹھ گئے۔ جب چلہ پورا ہو گیا تو مزار پاک کی طرف متوجہ ہوئے۔

''اے داتا! نظر کرم فرمائیں۔''

آپ بار بار یہی کہتے تھے لیکن کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ اس خیال نے پریشان کر دیا کہ شاید حاضری قبول نہیں ہوئی۔ اس خیال کے آنے کی دیر تھی کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اچانک آپ پر کیفیت طاری ہوئی۔ آواز آئی۔

''معین الدینؒ!''

''جی حضور''

''کیوں روتے ہو؟''

''مجھے خیال آیا تھا کہ شاید حاضری قبول نہیں ہوئی۔''

''حاضری قبول کی۔ میں تو اس لیے جواب نہیں دیتا تھا کہ تمہارا قرآن پڑھنا مجھے بے حد پسند ہے۔ آج سے تم ہند الولی ہو''

آپ نے ہند کی سرحد پر بیٹھے ہوئے شیر کو منا لیا تھا۔

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے اس کو رام کیا

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ایک ماہ مزید لاہور میں گزارا۔ اس دوران وہ اجمیر کے متعلق خبریں جمع کرتے رہے۔ اسی دوران آپ کو معلوم ہوا کہ پرتھوی راج کے ملازم سپاہی مسلمان مسافروں کی تلاش میں ہیں۔ نجومیوں کی پیش گوئی کی روشنی میں وہ ایسے درویش کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں جو پرتھوی راج کی سلطنت کے خاتمے کا سبب بنے گا۔ آپ کو معلوم تھا کہ وہ درویش وہ خود ہیں۔ قدم قدم پر ان کی جان کو خطرہ ہے لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ تاجدارِ مدینہ حضرت محمدؐ کی ہدایت پر اجمیر کا سفر کر رہے ہیں۔ معمولی سپاہی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انہیں اجمیر تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

ضروری انتظامات کے بعد آپ اپنے رفقا کے ہمراہ اجمیر جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ پٹیالہ کے قریب پہنچ کر آپ نے پہلا پڑاؤ کیا۔ ویرانے میں آگ روشن ہو گئی۔ خیمے لگا دیے گئے۔ عبادت و ریاضت میں رات بسر ہو گئی۔

راجا کے جاسوس جنگلوں' ویرانوں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا تو مسلمانوں کا بھیس بدلا اور چہروں پر عقیدت کی پرچھائیاں سجائے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہ کسی بادشاہ کا دربار تو تھا نہیں کہ چھان بین ہوتی۔ آپ کے مریدوں نے یہی سمجھا کہ علاقے کے عقیدت مند مسلمان ہیں' حضرت کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ خواجہ معین الدینؒ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ جب ان جاسوسوں نے آپ کو دیکھا اور فراہم کردہ تصویر سے ملایا تو پہچان لیا کہ یہی وہ درویش ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی ہے۔

''حضرت ہماری نصیحت کے لیے کچھ ارشاد فرمائیے۔'' ان لوگوں نے کہا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے پہلے ہندوستان کی معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا۔ پھر بہ حیثیت مسلمان انہیں ان کی ذمے داریاں یاد دلائیں۔ کتاب و سنت پر چلنے کی تلقین فرمائی۔

یہ لوگ بڑے غور سے سنتے رہے بلکہ بعض تو آپ کے ارشادات کو لکھتے بھی رہے تا کہ عقیدت کا ڈھونگ پوری طرح رچایا جا سکے' ان ارشادات کو سن کر انہیں کامل یقین ہو گیا تھا کہ

یہی وہ درویش ہے جس کی انہیں تلاش ہے۔ اب وہ آپ کے قتل کی تدابیر سوچ رہے تھے۔ آخر ان میں سے ایک نے بڑے ادب کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی ترجمانی کی۔

''یا حضرت! کرم فرمائیں۔ ہمارے پاس ٹھہریں تا کہ ہم بھی آپ کی برکتوں سے مستفید ہوں۔ ہمارے ہوتے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ آپ اس ویرانے میں قیام فرما ہوں۔''

آپ نے مراقبہ کیا۔ دربارِ رسالت سے بشارت ہوئی ''ان لوگوں کی نیت بد ہے' دغا فریب کرنا چاہتے ہیں ٹھہرنا مناسب نہیں۔''

''آپ لوگوں کا شکریہ' ہم عجلت میں ہیں رک نہیں سکتے۔'' آپ نے ارشاد فرمایا۔

''حضور! آپ ہمیں کیوں اپنے فیض سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔''

''ہم تمہیں ہر جگہ سے فیض پہنچاتے رہیں گے۔'' آپ نے فرمایا اور رفقا کو سفر جاری رکھنے کا حکم دیا۔

حکم ملنے کی دیر تھی کہ ساتھیوں نے اپنا اپنا سامان سروں پر اٹھایا اور تیزی سے چل دیے۔ آپ کے روحانی رعب و جلال کا اثر تھا کہ وہ لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔ کسی کو روکنے کی ہمت تک نہ ہو سکی۔ سوچ سکے تو اتنا کہ کوئی بات نہیں، اگر یہاں سے بچ گئے ہیں تو آگے قابو آجائیں گے۔ قافلہ یوں اٹھ گیا جیسے یہاں کبھی کوئی آ کر ٹھہرا ہی نہیں تھا۔

شہاب الدین محمد غوری نے غزنیں سے آ کر نہ صرف ملتان پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ راجا پرتھوی راج کے مضبوط قلعے بھٹنڈہ کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور اب وہ علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ شہاب الدین غوری غزنیں واپس چلا گیا تھا۔

راجا پرتھوی راج مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے بے تاب تھا۔ دن رات جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ عوام کو ایک ایک پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ جنگ کے خوف سے ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ اور آپ کے رفقا ان حالات سے بے پروا جنگلوں' بیابانوں میں اذانیں دیتے' رکوع و سجود کرتے اجمیر جانے کے لیے دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دہلی' راجا پرتھوی راج کا پایۂ تخت تھا لیکن اس کا مستقل قیام اجمیر میں رہتا تھا۔ دہلی کفرستان بنا ہوا تھا۔ یہاں کے ہندو' مسلمانوں کا منہ دیکھنا گناہ سمجھتے تھے۔ نماز تو بڑی بات اذان کی آواز تک انہوں نے نہیں سنی تھی۔ ہر طرف کفر و شرک اور بت پرستی تھی۔ ایسے شہر میں اہلِ صفا کا پورا قافلہ لے کر پہنچنا موت کو دعوت دینا تھا لیکن آپ بے خوف و خطر دہلی کی دہلیز تک پہنچ گئے۔ اسی وقت یہ خبر دہلی تک پہنچ گئی کہ شہاب الدین محمد غوری اپنے لشکر کے ساتھ غزنیں سے نکل چکا تھا اور کسی بھی وقت ہندوستان پہنچ جائے گا۔ اہلِ دہلی میں سراسیمگی پھیل گئی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ اس آپا دھاپی نے سب کی بینائی چھین لی اور آپ کسی قابلِ ذکر مخالفت کا سامنا کیے بغیر دہلی میں داخل ہو گئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور آپ نے اپنے اصحاب سمیت حضرت شیخ رشید مکی کے مقبرے کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔ چاروں طرف کفر کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس اندھیرے میں کوئی مسلمان دینِ حق کی شمع روشن کرنے آ پہنچا ہے۔ اہلِ دہلی کے دل تو اس وقت دہلے جب فضا میں اللہ اکبر کی آوازیں گونجیں کفار نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ کچھ لوگ اس آواز کا کھوج لگانے کے لیے دوڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ صفیں باندھے کھڑے ہیں' کبھی جھکتے ہیں کبھی سجدے میں جاتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی بت نہیں ہے پھر یہ سجدہ کس کو کر رہے ہیں؟ انہوں نے سوچا موقع اچھا ہے ان سب کا یہیں کام تمام کر دیا جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ ہاتھ اٹھانے کی طاقت نہ رہی۔ عاجز ہو کر سب کے سب واپس پلٹ گئے۔ کچھ دیر بعد اذان کی آواز پھر بلند ہوئی۔ کچھ لوگ نقصان پہنچانے کی غرض سے پھر وہاں پہنچے۔ اس مرتبہ بھی یہی واقعہ پیش آیا' اور جب بار بار یہی ہوا تو اپنی آگ میں خود جلنے لگے۔ ان خطرناک لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

ایک دن ایک سخت دل کافر نے ہمت کر کے تیز دھار خنجر اپنی بغل میں چھپایا اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کی خدمتِ عالیہ میں پہنچ گیا۔ نیت یہ تھی کہ کسی طرح باتوں میں لگا کر آپ پر حملہ کر دے گا۔ جب اسے خواجہ کی بارگاہ تک باریابی کا موقع مل گیا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنا ارادہ پورا کر سکے گا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے مومنانہ فراست سے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جس ارادے سے آئے ہو وہ پورا کرو۔ میری گردن حاضر ہے۔''

جب اس نے یہ سنا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ بغل سے خنجر نکال کر پھینک دیا اور خود آپ کے قدموں پر گر پڑا۔

''مجھے معاف کر دیں۔ اپنے اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔''

''اٹھو۔'' آپ نے نہایت شفقت سے فرمایا ''جاؤ

میں نے تمہیں معاف کیا۔"

"حضرت اب میں کہاں جاؤں گا۔ مجھے تو اپنے ساتھ ملالیں۔"

حضرت خواجہ نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔ اسے مشرف بہ اسلام کیا، وہ شخص اس وعدے کے ساتھ لوٹ گیا کہ وہ اپنے لوگوں میں خاموشی سے اسلام کی تبلیغ کرتا رہے گا اور جب تک حضرت یہاں مقیم ہیں' وہ ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتا رہے گا۔

آپ کے حسن سلوک' اخلاق کریمانہ اور انداز عبادت نے اہل دہلی کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اجنبیت دور ہونے لگی تھی۔ اب اتنا ہو گیا تھا کہ آپ آزادانہ شہر میں گھومنے لگے تھے۔ میل ملاپ کے مواقع ملنے لگے تھے۔ آپ کو یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ یہاں بہت جلد اسلام پھیل جائے گا۔ لیکن آپ کو اجمیر جانے کا حکم ہوا تھا۔ یوں بھی دہلی میں زیادہ قیام خلافِ حکمت تھا۔ حالات ایسے تھے کہ شہاب الدین محمد غوری اور راجا پرتھوی راج کی افواج کا ٹکراؤ کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔ آپ یہ نوبت آنے سے پہلے دہلی سے نکل جانا چاہتے تھے۔

اس روز فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر مراقبے کی صورت میں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اچانک اپنے مرید اور خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین اوشی کو مخاطب کیا۔

"بیٹا قطب الدین!"

"یا مرشد"

"ہم آج اجمیر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔"

"بہت بہتر۔"

"میں تمہیں دہلی میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ آج سے یہ علاقہ تمہارا ہے۔"

"حضرت! آپ سے جدائی؟"

"میل ملاقات اور خط و کتابت ہوتی رہے گی۔" آپ نے خواجہ قطب الدین کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے تسلی دی "اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں تمہارے ساتھ ہیں۔ یہاں بہت جلد اسلام پھیلنے والا ہے۔ اس لیے یہاں تمہاری موجودگی ضروری ہے۔"

"آپ بہتر جانتے ہیں۔"

قافلے میں چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حضرت بختیار اوشی راضی بہ مرشد تھے لیکن پھر بھی آپ کی حالت اس بچے کی طرح تھی جسے کسی نے اس کی ماں سے جدا کر دیا ہو۔ قافلے کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک چلے اور پھر مرشد سے بغل گیر ہو کر واپس لوٹ گئے۔

دہلی سے اجمیر تک یہی نظر آیا کہ جنگ کا خوف لوگوں پر مسلط ہے۔ ہر طرف نفسا نفسی پھیلی ہوئی ہے لوگ اتنے خوف زدہ تھے اور اپنے بچاؤ کی فکر میں لگے ہوئے تھے کہ کسی کی توجہ اس طرف نہ ہو سکی کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس طرف جاتے ہیں۔ اس میں آپ کی باطنی قوت کا بھی دخل تھا کہ لوگ انہیں دیکھتے تھے پھر بھی کوئی توجہ نہ دیتے تھے' ورنہ کسی دنیاوی ہتھیار کے بغیر اتنے بڑے قافلے کا نقصان اٹھائے بغیر گزر جانا ممکن نہیں تھا۔

یہ قافلہ اجمیر میں داخل ہوا تو ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ راجا پرتھوی راج اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ قلعہ بھٹنڈہ کی تسخیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ دوسری طرف شہاب الدین غوری ہوا کے دوش پر سوار چلا آرہا تھا۔ اجمیر میں لوگ سہمے ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھی اجمیر کی سڑکوں سے گزر رہے تھے لیکن کسی کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔

آپ کو شہر میں داخل ہوتے ہی بڑے بڑے مندر نظر آئے۔ ان مندروں کے بتوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ بت شکن شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد یہ سوال درپیش تھا کہ کہاں قیام کیا جائے۔ آپ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک مندر کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ شہر کا سب سے بڑا مندر تھا۔ اور مہاراجوں' مہارانیوں' اور رانیوں کے لیے مخصوص تھا۔ غریب غربا یہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس مندر کے ساتھ ہی ایک تالاب تھا جس کا نام اناساگر تھا۔ اناساگر کے قریب ذرا فاصلے پر گھنے سایہ دار درخت تھے۔ آپ کو یہ مقام پسند آیا لہٰذا آپ نے یہاں پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ اپنے ساتھیوں پر ظاہر کر دیا۔

"ہم یہاں قیام کریں گے"

"یہاں سے تو مندر بہت قریب ہے ہم سب کی نظروں میں آجائیں گے۔"

"سورج اگر نظر نہ آئے تو اسے سورج کون کہے۔"

"یہ ہندوؤں کا کوئی مقدس تالاب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ہندو نہانے کے لیے آتے ہوں گے۔ ہماری موجودگی ان پر شاق گزرے گی۔"

"اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا۔" حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔

ساتھیوں نے جب آپ کا اصرار دیکھا تو درختوں کے سائے میں سامان اتار دیا۔ اناساگر کا تالاب سامنے تھا، نماز کا وقت قریب تھا' مسلمانوں نے اناساگر کے پانی سے وضو کیا

اور پھر اللہ اکبر کی صدائے دل نواز بلند ہوئی۔ مندروں کی گھنٹیوں کے سوا کوئی آواز اب تک یہاں سنائی نہیں دی تھی۔ یہ آواز اجنبی بھی تھی اور حیران کن بھی۔ لوگ گھروں سے نکل آئے' دکانوں سے اتر آئے۔ ''کہیں سے مسلمان گھس آئے ہیں۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔'' لوگوں نے کہا اور انا ساگر کی طرف چل دیئے جہاں سے ابھی اذان کی آواز آئی تھی۔ قریب پہنچے تو دیکھا درختوں کے سائے تلے کچھ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ ایک نورانی چہرے والا شخص سب سے آگے کھڑا ہے۔

''یہ تو وہی شخص لگتا ہے جس کی پیش گوئی نجومیوں نے کی تھی۔'' ہجوم میں سے کسی نے کہا اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

شام کا دھندلکا چھا رہا تھا کہ راجا پرتھوی راج کے ملازم چرواہے اونٹ لے کر آگئے۔ انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ پہلے ہی سے درختوں کے نیچے بسیرا کیے ہوئے تھے۔ وہ چرواہے .... حضرت خواجہ معین الدینؒ کے پاس آئے۔

''یہ جگہ فوراً خالی کر دو۔''

''کیوں؟ یہاں ٹھہرنے میں کیا برائی ہے؟''

''یہاں پرتھوی راج کے اونٹ بیٹھیں گے۔''

''یہاں سے وہاں تک زمین پڑی ہے' کہیں بھی بٹھا دو۔''

''نہیں۔ وہ یہیں بیٹھیں گے۔'' ملازموں نے ڈانٹ کر کہا۔

اب ملازموں کے تیور بگڑنے لگے تھے لہٰذا آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''سامان اٹھالو' ہم ذرا ہٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں راجا کے اونٹ بیٹھنا چاہتے ہیں تو بیٹھے رہنے دو۔''

آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر انا ساگر کے کنارے پر چلے گئے۔ درختوں کے تلے اونٹ بیٹھ گئے۔ رات آگئی۔ اونٹوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ قافلے والے رات بھر اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔ ذرا دیر کو سب نے آرام کیا اور پھر نماز فجر کے لیے اٹھ بیٹھے۔

ذرا دن چڑھا تھا کہ چرواہے آگئے۔ مقامی زبان میں کچھ گاتے جا رہے تھے اور درختوں سے بندھی اونٹوں کی رسیوں کو کھولتے جا رہے تھے۔ رسیاں تو کھل گئیں لیکن جب وہ اونٹوں کو اٹھانے لگے تو وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

''آج انہیں کیا ہو گیا۔ اونٹ تو ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھتے تھے۔''

انہوں نے پھر کوشش کی مگر بے سود۔ پریشانی ان کے چہروں سے عیاں تھیں۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اونٹوں کو ڈانٹ رہے تھے' ٹھوکریں مار رہے تھے مگر وہ پتھر کے بنے بیٹھے تھے' حالانکہ زندہ بھی تھے اور گوشت پوست کے بھی تھے۔

''یہ سب اس جادوگر کی کارستانی ہے۔'' ایک چرواہے نے قافلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کل ہم اس کے ساتھ بولے بھی تو بڑی بدتمیزی سے تھے۔''

''یہ تو پھر بہت بڑا جادوگر ہوا۔''

''دیکھتے نہیں' اونٹ اٹھنا ہی بھول گئے ہیں۔''

''اب کیا کریں۔''

''کرنا کیا ہے اس جادوگر کے پاس چلتے ہیں۔ وہی اس جادو کو ختم کرے گا ورنہ یہ اونٹ یہیں بیٹھے بیٹھے بھوک پیاس سے مر جائیں گے۔''

وہ چرواہے انا ساگر کے کنارے آئے حضرت خواجہ معین الدینؒ سے معافی مانگی۔ جب آپ نے معاف کر دیا تو ان کی ہمت ہوئی۔

''آپ اپنا جادو واپس لے لیں اور ہمارے اونٹوں کو اٹھنے دیں۔''

''ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا جادو سے کوئی واسطہ نہیں۔'' حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔ ''یہ اونٹ اللہ کے حکم سے بیٹھے ہیں اور اسی کے حکم سے اٹھ بیٹھیں گے۔''

''تو پھر اپنے اللہ سے کہو' ورنہ ہماری تو نوکریاں چلی جائیں گی۔''

''تم واپس تو جاؤ۔ اللہ کے حکم سے اٹھ جائیں گے۔''

وہ چرواہے کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے بہر حال واپس آگئے۔ اونٹ انہیں دیکھتے ہی اٹھ گئے جیسے پہلے اٹھ جایا کرتے تھے۔ ان چرواہوں پر آپ کی اس کرامت کا بڑا اثر ہو۔ اونٹ لے کر جدھر سے گزرتے تھے یہ واقعہ بیان کرتے جاتے تھے۔

یہی چرواہے جب شام کو اپنے اونٹ باندھنے آئے تو لامحالہ ان کے دل میں خیال آیا کہ کچھ دیر ان فقیروں کے پاس بھی بیٹھا جائے۔ وہ بڑے ادب سے آئے اور سر جھکا کر خواجہ معین الدینؒ کے پاس بیٹھ گئے۔

''اچھا ہوا تم آگئے۔ اس لیے کہ نیک لوگوں کی صحبت نیکی کرنے سے بہتر اور برے لوگوں کی صحبت بدی کرنے سے بدتر ہے۔ بدبختی کی علامت یہ ہے کہ انسان گناہ کرتا ہے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کا مقبول ہونے کا امیدوار رہے۔'' حضرت

خواجہ معین الدینؒ ان چرواہوں سے باتیں کر رہے تھے۔

''آپ مسلمان ہیں۔ ہماری ذات کے نہیں ہے پھر بھی آپ نے ہمیں اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دی۔''

''ہمارے مذہب میں ذات پات کی تفریق نہیں۔ سب اللہ کے بندے ہیں۔ آپس میں سب برابر ہیں۔''

''آپ اللہ کے بندے ہیں۔ ہم تو دنیا دار چرواہے ہیں۔''

''یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ کیا خبر تم مجھ سے بہتر ہو۔ بتوں کی پوجا چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کرو۔ تم ہم سے بہتر ہو جاؤ گے۔''

وہ سب حیرانی سے سن رہے تھے۔ ان باتوں میں نہ کوئی پیچیدگی تھی نہ کوئی ہیر پھیر۔ انہی کی زبان میں باتیں ہو رہی تھیں۔ خواجہ صاحب کا لہجہ بھی شگفتہ اور دل موہ لینے والا تھا۔ غرور تھا نہ تکبر۔ انہیں ایسا لگا جیسے اپنے ہی جیسے کسی آدمی سے بات کر رہے ہیں۔ جب جانے کے لیے اٹھے تو خواجہ صاحب نے کھڑے ہو کر ان سے مصافحہ کیا۔

''آپ مسلمان ہو کر ہم سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔''

''ہم انسان بھی تو ہیں۔'' خواجہ صاحب نے کہا۔

وہ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو راستے بھر خواجہ صاحب ہی کی باتیں کرتے رہے۔ ان کے اپنے مذہب کے ہندو پنڈت انہیں اپنے پاس بیٹھنے تک نہیں دیتے تھے۔ اونچی ذات اور نیچی ذات کی تفریق وہ عام دیکھ رہے تھے۔ ان درویشوں کے اخلاق نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ ان کے دل میں جو ایک خوف سا بیٹھا ہوا تھا نکل گیا۔ اب وہ جس سے بھی ملے ان درویشوں کے حسنِ اخلاق کے قصے بڑھا چڑھا کر بیان کیے۔

ان چرواہوں کی ہر شام خواجہ صاحب کے ساتھ گزرنے لگی۔ ہر ملاقات میں وہ ایک نیا تاثر لے کر اٹھتے۔ وہ جس سے بھی ان فقیروں کی تعریف کرتے' اس کے دل میں بھی ملاقات کا شوق پیدا ہونے لگتا۔ کوئی اس بات پر حیران تھا کہ ایک فقیر نے راجا کے اونٹ بٹھا دیئے۔ کوئی اس بات پر حیران تھا کہ وہ مسلمان ہو کر ہندوؤں کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں چھوت چھات کا نظام تھا' ذات پات کی تفریق تھی، نچلی ذات کے ہندوؤں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ عبادت تک کی اجازت نہیں تھی۔ غریب اور امیر کی تفریق تھی۔ خواجہ صاحب کے حسنِ اخلاق پر سب کو حیرت ہوئی تھی۔ کوئی یہ دیکھنے پہنچا کہ وہ کیسا فقیر ہے جس کے ایک اشارے پر اونٹ بیٹھ جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کو پریشانیوں اور مصیبتوں نے ابھارا کہ وہ دعا کے لیے اس فقیر کے پاس جائیں۔ کسی نہ کسی طرح عوام کا رخ آپ کی طرف ہو گیا۔ ان میں زیادہ تعداد غریبوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کی تھی۔ معاشرے میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی لیکن جب وہ غریب نواز کے ڈیرے پر پہنچتے تو انہیں عزت و احترام سے بٹھایا جاتا۔ ان کے دکھوں کا مداوا کیا جاتا۔ ان کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جاتے۔ دعاؤں میں تاثیر تھی۔

جب لوگوں کے کام ہونے لگے تو ان کا اعتقاد بھی بڑھنے لگا۔ اب تک وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے لیکن جب قریب آئے ان پر حقیقت روشن ہوئی تو نفرت میں بھی کمی آئی۔ بعض تو اتنے متاثر ہوئے کہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ پھر یہ تعداد بڑھنے لگی، جو کام بادشاہوں کی تلواروں سے ممکن نہیں تھا' دربارِ تصوّف کے ایک فقیر نے کر ڈالا۔

پنڈت اور پروہت تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کوئی مسلمان فقیر آیا ہے۔ کچھ دن ٹھہرے گا چلا جائے گا۔ لیکن جب اس نے قدم ہی جما لیے اور نوبت یہ آ گئی کہ بہت سے ہندو اپنا مذہب ترک کر کے نیا دین قبول کرنے لگے تو ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ جوگیوں کی کٹیاؤں میں زلزلہ آ گیا۔

''یہ شودر لوگ اس مسلمان کی باتوں میں آ گئے تو ہماری کون سنے گا؟''

''ہمیں پوجا پاٹ کے لیے کون بلائے گا۔ چڑھاوے کون چڑھائے گا؟''

''دیوتا ہمیں شراپ دیں گے۔''

''دیوتاؤں کو تو چھوڑو' راجا جب جنگ سے واپس آئے گا تو ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

مختلف مشورے ہوتے رہے۔ تمام پنڈت بڑے مندر میں موجود تھے اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے ترکیبیں سوچ رہے تھے۔ آخر طے پایا کہ ان فقیروں کو اجمیر سے نکال دیا جائے۔ انہوں نے اپنے چند آدمیوں کو حضرت معین الدینؒ کے پاس بھیجا۔

''آپ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ اجمیر میں آپ نہیں رہ سکتے اور اناساگر سے پانی بھی نہیں لے سکتے۔''

''سب ہی لوگ اس تالاب سے پانی لے جاتے ہیں اگر تھوڑا پانی ہم استعمال کر لیتے ہیں تو کسی کا کیا نقصان ہے؟''

''وہ لوگ ہمارے دھرم کے ہیں۔ یہ پوتر جل ہے' تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔''

جب بحث طول پکڑنے لگی تو خواجہ معین الدینؒ تشریف لائے ''صرف ایک مشکیزہ پانی لینے کی اجازت دے دو۔ اس کے بعد ہم تم سے پانی نہیں مانگیں گے۔''

''ٹھیک ہے ایک مشکیزہ لے لو۔ اس کے بعد اجازت نہیں ہوگی۔'' ایک پروہت نے آگے بڑھ کر کہا۔

آپ نے ایک خادم کو اشارہ کیا کہ مشکیزہ لا کر ایک مشکیزہ پانی لے لو۔ خادم مشکیزہ لینے چلا گیا اور تمام پروہت خوشی خوشی واپس چلے گئے۔ راستے میں باتیں کرتے جارہے تھے کہ ایک مشکیزہ کتنے دن چلے گا۔ پیاس تنگ کرے گی تو خود بھاگ جائیں گے۔ رات بیچ میں تھی دوسرے دن ہندو خوشی سے ناچتے 'گاتے 'بجاتے اپنے گناہ دھونے اناساگر کی طرف روانہ ہوئے۔ دل میں سوچتے جاتے تھے کہ اب تک تو مسلمان فقیر بھاگ چکے ہوں گے۔

یہ ہندو' اناساگر کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تالاب بالکل سوکھا پڑا ہے۔ پانی کہاں چلا گیا۔ یہ کوئی یقین آنے والی بات تھی ہی نہیں۔ شور مچاتے 'واویلا کرتے بستی کی طرف بھاگے۔

''اناساگر خشک ہوگیا۔''

''ایک قطرہ پانی بھی وہاں نہیں۔''

''فقیروں نے سارا پانی چرالیا۔''

یہ خبر ایسی تھی کہ جس نے سنی تصدیق کے لیے تالاب کی طرف بھاگا۔ اجمیر اور اس کے مضافات کے ہندو اناساگر تالاب پر جمع ہوگئے۔ لوگ اداس اور افسردہ تھے۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر درویشوں کی طرف دیکھ لیتے تھے جو اطمینان سے بیٹھے ذکر و عبادت میں مشغول تھے۔ تھوڑی دیر میں راجا کے افسران بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے سوکھے ہوئے تالاب کو دیکھا اور پھر دور بیٹھے فقیروں کو دیکھا۔ ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے بپھرے ہوئے مجمع کو سپاہیوں کے ذریعے وہیں روکا اور خود حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آپ نے انہیں نہایت احترام سے بٹھایا۔

''کیسے آنا ہوا؟''

''بابا جی! اناساگر کا پانی خشک ہوگیا ہے تمام لوگ سخت پریشان ہیں' ہمیں معلوم ہے یہ کیوں ہوا ہے۔ اب آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جتنا پانی چاہیں استعمال کریں۔''

''ہم نے تو آپ لوگوں کی اجازت سے ایک مشکیزہ پانی لیا تھا۔ وہ پانی ہم آپ کو لوٹا دیتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا اور خادم کو حکم دیا۔

خادم نے پانی سے بھرا مشکیزہ اٹھایا اور لے جا کر اناساگر میں انڈیل دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پورا تالاب اس ایک مشکیزہ میں بند ہوگیا تھا۔ مشکیزے کا پانی انڈیلتے ہی اناساگر میں پانی بھرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے تالاب کا پانی کناروں کا منہ چومنے لگا۔ لوگ تالیاں بجانے اور شور مچانے لگے۔ کئی ایک نے ''دھن ہو مہاراج خواجہ کی'' کے نعرے بلند کیے۔

یہ ایسی کرامت تھی جو تقریباً پورے اجمیر کے سامنے ظہور میں آئی تھی۔ سب نے اپنی آنکھوں سے تالاب کو بھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے دل اپنے مذہب کی طرف سے ہٹنے لگے۔ بعض شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگئے 'بعض نے ہمت کی اور حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیا۔ جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا وہ بھی متاثر ضرور ہوئے۔ اتنا ضرور ہوا کہ اب وہ بھی حضرت خواجہ معین الدینؒ کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگے اور ان کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔

☆☆☆☆

ترائن کے مقام پر شہاب الدین غوری اور راجا پرتھوی راج کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ دونوں فریقین مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ شہاب الدین غوری کے ساتھ خلجی' غوری اور خراسانی امرا آئے تھے۔ پرتھوی راج نے ہندوستان بھر کے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملایا تھا۔ ہندو دھرم کی بقا کا سوال تھا۔ ان میں سے ہر ایک مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔ دوسری طرف شہاب الدین غوری کا لشکر بھی ہندوستان میں دین اسلام کی جنگ لڑنے کا جذبہ دل میں لے کر آیا تھا۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملے کیے۔ پورا دن گزر گیا۔ ایک سپاہی کے قدم بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔ دوسرے دن بھی جنگ کا نقشہ یہی رہا۔ دونوں طرف کی فوجیں نہایت پامردی سے لڑ رہی تھیں۔ دن بھر جنگ جاری رہتی اور شام کو کسی نتیجے کے بغیر تلواریں نیام میں چلی جاتیں۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری رہتا کبھی دوسرے کا۔

جب اسی کیفیت میں کئی دن گزر گئے تو سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ آئے ہوئے امرا میں بددلی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ وہ تو یہ سوچ کر شہاب الدین کے ساتھ چلے آئے تھے کہ ہندو تر نوالہ ہیں۔ جنگ کا فیصلہ ہوتے ہی خوب مال و دولت ہاتھ لگے گا لیکن راجا کی فوجیں جی کھول کر داد شجاعت دے رہی تھیں' لہٰذا جنگ کا فیصلہ جلدی ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

مسلمانوں کی اس بددلی کو راجا پرتھوی راج نے محسوس کرلیا اور اس کے حوصلے بڑھ گئے۔ اس کے سپاہیوں نے تابڑ توڑ حملے شروع کردیے۔ اب مسلمانوں کے قدم بالکل ہی

اکھڑ گئے۔ شکست کے بادل منڈلانے لگے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ شہاب الدین غوری زخمی ہوگیا۔ اسے اپنے سرداروں پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت جانی کی فی الحال قلعے کا دفاع چھوڑ کر غزنیں واپس لوٹ جائے۔ اس نے اپنی فوجوں کو نکال لیا۔ آسمان نے یہ منظر بڑے غور سے دیکھا کہ پرتھوی راج بھاگتی ہوئی مسلمان فوجوں کا تعاقب کر رہا ہے۔ پرتھوی راج نے بڑی دور تک مسلمان سپاہیوں کا تعاقب کیا اور پھر واپس آکر قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

اسلامی لشکر غزنیں واپس لوٹ گیا تھا لیکن قلعہ بھٹنڈہ اب بھی تسخیر نہیں ہوسکا تھا۔ مسلمان شہادت کے جذبے سے سرشار تھے اور کسی طرح ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں تھے۔ جب یہ محاصرہ طول کھینچنے لگا تو راجا نے اپنے لڑکے ''کولا'' کو قلعے کی تسخیر پر مامور کیا اور خود اجمیر واپس لوٹ گیا۔

راستے بھر اس کے نام کی جے جے کار ہوتی رہی۔ جس طرف سے گزرا ہندوؤں نے کسی اوتار کی طرح اس کا استقبال کیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اجمیر کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ جب وہ اجمیر میں داخل ہوا' مندروں میں گھنٹیاں اور سنکھ بج رہے تھے۔ گیندے اور گلاب کے پھول سڑکوں پر بکھرے پڑے تھے۔ کوٹھے ناریوں سے اور گلیاں جھنڈیوں سے بجی ہوئی تھیں۔ راجا جونہی اجمیر میں داخل ہوا' محل میں جانے کے بجائے اناساگر کے قریب بنے ہوئے بڑے مندر میں پہنچ گیا تاکہ دیوتا اس سے خوش ہوں۔ ابھی اس نے مندر میں قدم ہی رکھا تھا کہ اذان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ کیسی آواز ہے۔ اجمیر میں اذان کی آواز؟'' اس نے قریب کھڑے ہوئے اپنے عمال سے پوچھا۔

''مہاراج' کچھ دنوں سے ایک فقیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر ٹھہرا ہے۔''

''میں کچھ دیر اجمیر سے باہر کیا رہا' یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اس مسلمان فقیر کی اتنی ہمت!''

وہ اتنا برہم تھا کہ پوجاپاٹ بھی بھول گیا۔ الٹے قدموں مندر سے نکل گیا۔ ہاتھی پر بیٹھ سیدھا اپنے محل پہنچ گیا۔ عمال اور امرا ہاتھ باندھ کر حاضر ہوگئے۔

''اس مسلمان فقیر کو فوراً اجمیر سے نکال دو۔ میں ایک پل کے لیے اس کا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔''

''مہاراج' اب یہ اتنا آسان نہیں رہا۔''

''کیا مطلب؟ میں نے شہاب الدین غوری کو فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ یہ فقیر کس گنتی میں ہے۔''

''مہاراج' شہاب الدین کی بات اور ہے۔ یہ فقیر لوگ ہیں۔ دلوں پر حکومت کرتے ہیں، ان فقیروں نے عوام کے دل جیت لیے ہیں۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو عوام اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

''میری تلوار ہر بغاوت کو کچل دے گی۔''

''مہاراج' بدھی سے کام لیجئے۔'' ایک پنڈت نے کھڑے ہو کر کہا ''کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجئے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''میرا کام تلوار چلانا ہے۔ بدھی تم استعمال کرو۔''

''پھر یہ کام ہم پر چھوڑ دیجئے۔ ہم اسے یہاں سے نکال کر دم لیں گے' لیکن دھیرج سے۔''

''ٹھیک ہے' تم جو کرسکتے ہو کرو۔''

ان پنڈتوں نے اکیلے میں راجا سے ملاقات کی اور دیر تک اسے اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔ طے یہ پایا کہ پہلے عوام کی عقیدت کو کم کیا جائے۔ ایک طرف یہ بات پھیلا دی کہ یہ اجنبی درویش دراصل شہاب الدین محمد غوری کا جاسوس ہے، دوسری طرف اپنے کچھ ملازموں کو اس کام پر متعین کیا کہ وہ اس درویش اور اس کے ساتھیوں کی خامیاں تلاش کریں اور راجا کو بتائیں تاکہ ان خامیوں کو عوام میں پھیلایا جائے یا ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس درویش کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔

اس حکم کو سنتے ہی یہ ملازم ادھر ادھر پھیل گئے۔ کچھ نے یہ وتیرہ اختیار کرلیا کہ عقیدت مند کا روپ دھار کر آپ کے پاس وقت بسر کرنے لگے۔ کبھی کبھی رات کو بھی وہیں رک جاتے تھے۔

ان لوگوں نے شب و روز میں کوئی بات بھی ایسی نہیں دیکھی جو آداب و اخلاق کے منافی ہو۔ اللہ کے ان نیک بندوں کی زندگیاں کھلی کتاب کی طرح تھیں۔ بے ہودہ گوئی تو کجا کھل کر قہقہے بھی نہیں لگتے تھے۔ زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ کہیں سے تلاوت کی آواز آرہی ہے کوئی نوافل ادا کررہا ہے' کبھی مریدین حلقہ باندھے بیٹھے ہیں اور حضرت خواجہ بزرگ حکمت و دانائی کے موتی نچھاور کررہے ہیں۔

ان لوگوں کے دلوں میں جو زہر بھرا گیا تھا' اس صحبتِ نیک سے رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا۔ دلوں کے پتھر سے چشمے پھوٹنے کے دن آگئے۔ جذبوں کے سوکھے درخت برگ و بار لانے لگے۔ نفرت کی جگہ خاموش محبت نے لے لی۔

ایک دن محفل بجی ہوئی تھی۔ باہر چاند کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی' خیمے کے اندر باتوں کی روشنی۔ سب مؤدب بیٹھے تھے

حضرت خواجہ معین الدینؒ وعظ و تلقین میں مشغول تھے۔ راجا کے آدمی بھی اس دن موجود تھے۔

آپ نے فرمایا "درویش وہ ہے کہ جس کے پاس جو بھی حاجت لے کر آئے تو اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرے۔" اور پھر آپ نے حکومتی اشخاص کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ "آپ کی اگر کوئی حاجت ہو تو بتائیں۔"

یہ حضرات اس نرم سلوک کو دیکھ کر اپنا راز پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ "حضور! ہمیں آپ کی خامیاں تلاش کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔" ان لوگوں نے بہ یک زبان کہا۔

"اگر کوئی خامی نظر آئی ہو تو بتائیں تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔" آپ نے اس عاجزانہ انداز میں کہا کہ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ لوگ کس مٹی کے بنے ہیں۔ راز کھل جانے کے بعد بھی برہمی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، انہوں نے سوچا اور سب کے سب آپ کے پاؤں میں گر پڑے۔

"حضور، ہم اسلام لے آئے۔ ہمیں قبول کیجئے۔ بے شک! یہی سچا مذہب ہے ہم اب تک اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ آپ نے ہمیں روشنی دکھائی ہے۔ ایسا ظرف تو ہم نے بادشاہوں میں بھی نہیں دیکھا جس کا مظاہرہ آپ نے کیا۔"

آپ نے انہیں اٹھایا۔ شفقت سے ان کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ "ابھی تم اپنے اسلام کو ظاہر مت کرنا ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہ دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ آتے جاتے رہنا۔"

شرمندگی ان کے چہروں سے ظاہر تھی۔ وہ سب اٹھے اور خیمے سے باہر نکل گئے۔ اب انہیں راجا کو یہاں کے حالات سے مطلع کرنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اپنا راز ظاہر کیے بغیر جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے' بے کم و کاست بیان کر دیں گے۔

انہوں نے جو کچھ وہاں دیکھا تھا' راجا کے گوش گزار کر دیا۔ راجا کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا طریقہ اختیار کرے۔ اس کے مشیروں نے اسے پھر ایک ترکیب بجھا دی۔ راجا کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک اشارہ کیا اور حسین ترین ہندو عورتیں اس کے سامنے حاضر ہو گئیں۔ ان عورتوں کا سندر روپ دیکھ کر ایک مرتبہ راجا کا دل بھی بے ایمان ہو گیا۔ ان کا لباس' ان کی ادائیں' قاتل مسکراہٹ ایسی تھی کہ بڑے سے بڑے زاہد کے قدم بھی لڑکھڑا جائیں۔ راجا کو یقین ہو گیا کہ اس کا یہ ہتھیار ضرور کامیاب ہو گا۔

"ناریو! تمہیں اپنی سندرتا پر بڑا ناز ہے؟"

"کیوں نہ ہو۔ ہم تو وہ ہیں کہ دیوتا بھی ہمیں للچا کر دیکھتے ہیں۔"

"کیا تم پتھر کو جونک لگا سکتی ہو؟"

"مہاراج، حکم تو کریں۔"

"تمہیں معلوم ہے' کچھ دنوں سے ایک فقیر انا ساگر کے قریب آ کر ٹھہرا ہے۔"

"ٹھہرا تو ہے۔"

"تم اس کے پاس جاؤ اور اسے بہکانے کی کوشش کرو۔"

"کوشش کیسی مہاراج' کسی کو شیشے میں اتارنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اس فقیر کی کیا حیثیت ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی پگھل جائے گا۔"

"اگر تم کامیاب ہو گئیں تو منہ مانگا انعام ملے گا۔"

"آپ کا اشیرواد ہی ہمارا انعام ہے۔" ان عورتوں نے کہا۔

ان عورتوں کے لیے بظاہر یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اتنی آسانی سے تیار ہو گئی تھیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا سابقہ ایسی شخصیت سے پڑنے والا ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو حقیر ذرے کی حیثیت بھی نہیں دیتا۔ جو اپنی خواہشات پر حکمرانی کرتا ہے۔ عشقِ الٰہی جس کے دل میں جاگزیں ہے۔ جس نے جمالِ الٰہی سے آنکھیں دو چار کی ہیں۔ دنیاوی حسن کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ان عورتوں نے سولہ سنگھار کیا۔ آفت بن کر' غضب میں ڈھل کر بارگاہ سنجری میں پہنچ گئیں جضرت خواجہ بزرگ کے ساتھیوں نے ان نئی مصیبتوں کو ایک نظر دیکھا اور پلکوں کی جھالر سے آنکھوں کی کھڑکیاں بند کر لیں۔ یہ ایمان شکار عورتیں جونہی حضرت خواجہ معین الدینؒ کے سامنے پہنچیں اور حضرت نے آنکھ اٹھا کر خفیف مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا' کسی انجانی قوت نے ان عورتوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے چہروں کو ڈھانپ لیں۔ ان کے ہاتھ اپنی اوڑھنیوں تک گئے اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئیں۔

"کہو میری بیٹیو! کون سی ضرورت تمہیں یہاں لے آئی؟"

"حضور' ہمیں ایک مسئلہ پوچھنا تھا۔"

"تم اپنا مسئلہ کسی کے ہاتھ کہلوا بھیجتیں تو اچھا تھا۔ بہر حال پوچھو' کیا پوچھنا ہے۔"

"پوچھنا یہ تھا کہ آپ کے مذہب میں عورتوں کا کیا مقام

ہے ہٗ'ان عورتوں نے اپنا حال چھپانے کے لیے یہ مسئلہ پوچھ لیا تاکہ یہی سمجھا جائے کہ وہ صرف مسئلہ پوچھنے آئی تھیں۔ ان کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

حضرت نے اختصار کے ساتھ ان کے مسئلے پر تقریر کی۔ جب اچھی طرح ان کی تشفی ہوگئی تو انہوں نے اجازت طلب کی۔ خاموشی سے اٹھیں اور گھونگھٹ نکالے نکالے وہاں سے چلی آئیں۔ وہ جس مقصد سے آئی تھیں دھرا کا دھرا رہ گیا۔

یہ عورتیں حیران تھیں کہ انہیں کس قوت نے گھونگھٹ نکالنے پر مجبور کیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگیں کہ انہوں نے اپنے راجا کی لاج نہیں رکھی۔ انعام کا لالچ الگ اکسار ہا تھا۔ انہوں نے پھر طے کیا کہ وہ وہاں جائیں گی اور اس فقیر کو بہکانے کی کوشش کریں گی۔ دوسرے دن وہ پھر بن سنور کر پہنچ گئیں۔ کسی قوت نے پھر انہیں بے بس کر دیا۔ انہوں نے پھر گھونگھٹ نکالا لئے بدن کو اچھی طرح ڈھانپا اور اپنا مسئلہ بیان کرنے بیٹھ گئیں۔

غرور و تکبر کو پاؤں کی پازیب بنا کر وہ ہندو عورتیں راجا پرتھوی راج کے دربار میں حاضر ہوگئیں۔ ان کے چہروں پر شرمندگی تھی' زبانیں کچھ کہنے سے قاصر تھیں' راجا کے طعنے سن رہی تھیں اور خاموش تھیں۔ انہیں اپنی موت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

آخر ایک نے ہمت کر کے کہا ''مہاراج! وہ فقیر بہت بڑا جادوگر ہے' اس کے سامنے پہنچتے ہی ہماری حالت غیر ہو جاتی تھی ہم اپنے چہرے ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کے پاس بہت شکتی ہے۔''

''بس اب آگے کچھ مت کہنا' دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔''

وہ عورتیں اس طرح وہاں سے اٹھ کر بھاگیں جیسے انہیں ڈر ہو کہ کہیں وہ رک گئیں تو راجا اپنا فیصلہ نہ تبدیل کر دے اور انہیں اپنی جان گنوانا پڑ جائے۔ وہ تو اسے بھی فقیر کی کرامت سمجھ رہی تھیں کہ راجا نے ان کو قتل کا حکم جاری نہیں کر دیا۔

پرتھوی راج غصے میں سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر نجومیوں کی پیش گوئی یاد آ رہی تھی۔ کہیں یہ فقیر وہی تو نہیں جو اس کی سلطنت کو خاک میں ملانے آیا ہے۔ مجھے جلد سے جلد اس کا کوئی انتظام کرنا چاہئے۔ پہلے خیال آیا کہ وہ خود جا کر اس فقیر سے معافی طلب کرے لیکن پھر شاہی وقار آڑے آ گیا۔ میں راجا ہو کر اس فقیر کے پاس خود چل کر جاؤں۔ یہ کام تو میرا کوئی پنڈت بھی کر سکتا ہے۔ اجمیر میں بڑے بڑے گیانی پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کی مدد لینی چاہئے۔

اس نے بڑے مندر کے سب سے بڑے پجاری کو بلایا۔

''رام دیو! دیکھ رہے ہو مسلمان درویشوں نے کیا اودھم مچا رکھا ہے؟ لوگ اپنا دھرم چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟''

''رام رام مہاراج۔ کون ایسا چاہے گا۔'' رام دیو نے کہا۔

''پھر تم اس کا کوئی اُپائے کرو۔''

''جو آپ کا حکم مہاراج۔''

''تو من تیل چراغوں میں جلا سکتے ہو۔ ایک فقیر کو شکست نہیں دے سکتے۔ جاؤ اور اس کی باتوں کا توڑ کرو۔ اسے اجمیر چھوڑنے پر مجبور کر دو۔''

''ابھی لو مہاراج۔ میں ابھی اپنے چیلوں کو لے کر وہاں پہنچتا ہوں۔''

رام دیو سیدھا مندر پہنچا۔ اپنے شاگردوں کو ساتھ لیا۔ موٹی موٹی کتابیں اٹھائیں اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے پاس پہنچ گیا۔ مریدین ارد گرد مؤدب بیٹھے تھے۔ علمی مجلس برپا تھی کہ آپ کی نظر رام دیو اور اس کے ساتھیوں پر پڑی۔

''اللہ کی رحمت ہے۔ مہمان تشریف لائے ہیں۔ انہیں بیٹھنے کو جگہ دو۔'' آپ نے اپنے مریدوں سے فرمایا۔

''ہم بیٹھنے نہیں آئے۔ آپ سے صاف صاف باتیں کرنے آئے ہیں۔''

''میرے مہربان۔ باتیں تو بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ تشریف تو رکھیں۔ کہئے کیا کہنا ہے؟''

''آپ نے اجمیر میں بڑا فساد برپا کیا ہے۔'' رام دیو نے کہنا شروع کیا ''لوگوں کو ان کے مذہب سے بدظن کر رہے ہیں۔ یہ آپ کی زمین نہیں ہے' راجا کا اجمیر ہے۔ بس جتنے دن رہ لیے بہت ہے' اب آپ اجمیر چھوڑ دیں۔''

وہ بولتا رہا اور آپ سر جھکائے سنتے رہے۔ آخر کار تھک ہار کے خود ہی چپ ہو گیا۔ آپ اس کی طرف کچھ دیر دیکھتے رہے کہ شاید کچھ اور کہے۔

''اور کچھ کہنا ہے؟'' آپ نے فرمایا۔

''جو کچھ کہہ لیا یہی بہت ہے۔ پہلے آپ ان باتوں کا جواب دیں۔''

''رام دیو! میں تیری پیشانی پر اسلام کا نور دیکھ رہا ہوں اور تو ہے کہ میرے ساتھ مناظرہ کر رہا ہے۔ میں تجھے جنت میں دیکھ رہا ہوں اور تو ہے کہ جہنمیوں کی وکالت کر رہا ہے۔''

ان لفظوں میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ ہونٹوں پر تالے پڑ

گئے، بھول گیا کہ کس مقصد سے آیا تھا۔ بس خواجہ صاحب کی طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔

''سوچ کیا رہے ہو کلمہ پڑھو۔''

وہ جیسے خواب سے جاگ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ کلمہ پڑھا اور حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔ ''میرا اسلام قبول کرو باباجی' میرا اسلام قبول کرو۔''

''اللہ قبول کرنے والا ہے۔ اٹھو' آج سے تمہارا اسلامی نام محمد عبداللہ ہے۔''

رام دیو کے چیلے یہ سب کارروائی بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ پنڈت رام دیو واقعی مسلمان ہوگیا ہے تو ان پر ہیبت طاری ہوگئی۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگے اور سیدھے پرتھوی راج کے پاس جا کر دم لیا۔

دھرم کا رکھوالا۔ بڑے مندر کا سب سے بڑا پجاری۔ شکار کرنے گیا تھا خود شکار ہوگیا۔ آنکھیں کھولنے کے لیے یہ واقعہ کافی تھا۔ پرتھوی راج کو یقین آگیا کہ اس فتنے کو آسانی سے نہیں دبایا جا سکتا۔ اس وقت اس کے غضب کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ انتقام کی آگ اس کے اردگرد جلنے لگی لیکن اب وقت نکل چکا تھا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس فقیر نے اجمیر کے ہندوؤں کو اپنے بس میں کرلیا ہے۔ اگر اس کے خلاف طاقت استعمال کی گئی تو ممکن ہے پرجا اس کے حق میں اٹھ کھڑی ہو۔ اسے یہاں سے ہٹا بھی دیا گیا تو وہ کہیں اور بسیرا کرلے گا۔ جب تک لوگ اس کے ساتھ ہیں اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ سوچ رہا تھا' اسے ابتدا میں ہی اس سیلاب پر بند باندھ دینا چاہئے تھا۔ اب بہت سارا وقت گزر گیا۔

اخلاق کریمانہ اور شفقت کا برتاؤ وہ ہتھیار ہے جس سے چٹانوں کو ریزہ ریزہ کیا جاسکتا ہے۔ سمندروں کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔ نفرتوں کو محبت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ خواجہ سنجری نے یہی کیا تھا۔ وہ جب اجمیر میں وارد ہوئے تھے' لوگ مسلمانوں کا نام سننا پسند نہیں کرتے تھے لیکن جیسے جیسے خواجہ کے قریب ہونے لگے' ان کے گن گانے لگے۔ انہوں نے کسی کو دھتکارانہ مذہب بدلنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے حق کا راستہ بتایا۔ ضرورت مندوں کی مدد کی۔ دکھی دلوں کی دل جوئی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے بڑا پجاری ان کا خادم بن کر رہنے پر مجبور ہوگیا۔ خدا کی خلقت ان کے پاس اپنی مرادیں لے کر آنے لگی۔ پرتھوی راج کے روکنے کے باوجود خلق خدا انا ساگر کے قریب آپ کی زیارت کو آنے لگی۔

''یا مرشد!'' رام دیو نے جواب محمد عبداللہ ہو چکا تھا ایک دن آپ سے درخواست کی ''میرے پاس جھالرہ میں ایک زمین کا ٹکڑا ہے' وہ میں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمائیں اور آبادی میں چل کر قیام کریں تاکہ مخلوق خدا یہاں تک آنے کی زحمت سے بچ جائے۔ وہیں مسجد بھی تعمیر کرلیں گے اور آپ کے لیے حجرہ بھی بن جائے گا۔''

آپ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور نئی زمین پر (جہاں اب آپ کا مزار ہے) منتقل ہوگئے۔ سب سے پہلے آپ نے ''مسجدِ اولیا'' کی بنیاد رکھی۔ مطبخ خانہ اور مریدین کے لیے جماعت خانہ کی تعمیر بھی شروع کرادی۔

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ راجا کے کچھ سپاہی گشت پر تھے کہ انہیں دور سے چراغ جلتے نظر آئے جیسے کوئی چراغاں کر رہا ہو۔ ''دیوالی تو ہے نہیں پھر یہ چراغاں کیسا۔ آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔''

''ارے یہ تو رام دیو کی زمین ہے۔ وہ کیا یہاں محل بنوا رہا ہے؟''

سپاہی قریب پہنچے تو کچھ مزدوروں کو کام کرتے ہوئے دیکھا۔

''یہ مزدور تو معلوم نہیں ہوتے۔ ہندو بھی نہیں ہیں۔ آؤ معلوم کرتے ہیں۔'' یہ سپاہی اور نزدیک آگئے ''اے! کیا کر رہے ہو؟''

''یہاں مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔''

''مسجد! اجمیر میں مسجد! کس نے کہا ہے تم سے کہ مسجد بناؤ؟''

''ہمارے مرشد حضرت معین الدینؒ نے اب یہاں قیام کرلیا ہے۔ وہ جہاں قیام کرتے ہیں مسجد تعمیر ہوتی ہے۔ اب تو تم سمجھ گئے ہوگے۔''

''اب ہم بالکل سمجھ گئے اور جا کر راجا کو بھی سمجھاتے ہیں۔''

وہ سپاہی بھاگم بھاگ دارودغہ کے پاس گئے' دارودغہ نے یہ خبر اپنے سے بڑے افسر کو پہنچائی۔ صبح تک اس خبر نے دربار میں ہلچل مچادی۔

''مسلمان رات کو چراغوں کی روشنی میں مسجد تعمیر کر رہے ہیں۔''

رانی ماں نے بھی سنا۔ بیٹے کو ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ نجومیوں کا کہنا ٹھیک ہی نکلا۔ وہ مسلمان درویش آ بھی گیا اور تم اسے روک نہیں سکے۔ اب اس نے قدم جمالیے ہیں۔ تمہاری رعایا اس کے گن گانے لگی ہے۔ اس سے مصالحت کرلو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ لیکن پرتھوی راج کا تکبر کسی نصیحت پر عمل کرنے نہیں دیتا تھا۔ ہر دار اوچھا پڑ رہا تھا لیکن وہ ہر بار اپنا

داؤ چلتا تھا۔ اس بار اس نے شہر بھر میں اعلان کرا دیا کہ کوئی دکاندار معین الدینؒ اور ان کے درویشوں کو تیل نہ دے۔ کوئی ہندو بھی اگر تیل لینے آئے تو اچھی طرح چھان بین کر لی جائے کہ وہ یہ تیل کس کے لیے خرید رہا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کا ایک خادم تیل خریدنے بازار آیا تو اسے یہ حکم سننے کو ملا۔ ہر دکاندار نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ''ہم مسلمانوں کے ہاتھوں تیل فروخت کر کے کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتے۔''

راجا کے خوف سے آپ کے ہندو عقیدت مندوں نے آپ کے لیے تیل فراہم کرنے سے معذرت کر لی اگر راجا کو معلوم ہو گیا تو ان کی خیر نہیں۔ راجا کے جاسوس ہر اس شخص کا پیچھا کر رہے تھے جو کسی دکان سے تیل خریدتا ہوا نظر آتا تھا۔

جب آپ کے مریدوں نے اپنی تشویش سے آپ کو آگاہ کیا تو آپ یہ کہہ کر چپ ہو گئے ''انشاء اللہ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔'' مغرب کا وقت ہوا اور آپ وضو کرنے کے لیے بیٹھے تو ایک برتن رکھ لیا جس میں وضو کا پانی جمع ہوتا رہا۔ جب وضو فرما چکے تو سب مریدوں کو بلایا۔

''اسے چراغوں میں ڈال دو۔ انشاء اللہ تیل کی طرح جلے گا۔''

اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مرید پریشان تھے کہ اگر روشنی کا انتظام نہ ہوا تو مسجد کی تعمیر کا کام رک جائے گا۔ جب آپ کا حکم سنا تو وضو کے اس پانی کو چراغوں میں ڈال دیا۔ چراغ جلائے تو اندھیرے میں چراغاں ہو گیا۔

راجا تک خبر پہنچی کہ فقیر کے چراغ تیل کے بغیر ہی جل رہے ہیں تو سخت حیران ہوا لیکن بدبختی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ قائل ہونے کے بجائے مزید دشمنی پر آمادہ ہو گیا۔ حضرت معین الدینؒ کی روحانیت کا کمال تھا جس نے راجا کی طاقت کو کمزوری میں بدل دیا تھا۔ وہ چاہتا تو آپ کے خلاف تلوار اٹھا سکتا تھا لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے درباریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔

''مسلمانوں کے فقیر معین الدینؒ نے اجمیر میں جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو۔ وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ اگر آج اس کا تدارک نہ کیا گیا تو آنے والے دنوں میں بہت بڑا فتنہ پیدا کرے گا۔ آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ کیا اس کے خلاف فوج کشی کروں؟''

''مہاراج! اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ جادوگر ہے، ہمارے لشکر کو جادو کے زور سے پتھر کا بنا دے گا۔ جادو کا توڑ تو جادو ہی سے کیا جا سکتا ہے۔''

''کون ایسا ہے جو اس کے جادو کو توڑ سکتا ہے۔''

''ان دنوں جے پال نامی جادوگر کا سکہ چلتا ہے۔ ہندوستان میں اس سے بڑا جادوگر نہیں ہے۔'' راجا کے وزیر نے کہا۔

''دیر کس بات کی ہے۔ جے پال کو جلدی بلاؤ تاکہ ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارا ملے۔''

چند دنوں کے بعد جے پال کو راجا کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ راجا کے لیے جے پال آخری سہارا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس مسلمان فقیر کو شکستِ فاش دے گا لہٰذا جے پال کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔

''وہ میرے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گا۔ آپ تاریخ مقرر کریں اسے مقابلے کی دعوت دیں' پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔'' جے پال نے بڑے تکبر سے کہا۔

راجا نے تاریخ کا اعلان کیا۔ اس کی اطلاع خواجہ معین الدینؒ کو بھی پہنچا دی گئی۔ آپ نے بچکانہ حرکت اور تاریخ کے بارے میں سنا اور مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

راجا نے اس مقابلے کا خوب ڈھنڈورا پیٹا۔ اس کے آدمی گرد و نواح کے دیہات میں جا کر خوب ڈھول تاشے پیٹتے اور اعلان کرتے ''مسلمان جادوگر اور ہندو جادوگر کا مقابلہ ہو گا۔''

لوگوں نے کشتی کے مقابلے دیکھے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جنگیں دیکھی تھیں۔ لیکن جادوگروں کا مقابلہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت سے تو ایسے تھے جنہوں نے مسلمان ہی نہیں دیکھے تھے۔ ان کے لیے یہ اعلان بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ جیسے جیسے مقابلے کی تاریخ قریب آتی گئی' لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ بے شمار لوگ اجمیر آنا شروع ہو گئے۔ مقررہ تاریخ سے پہلے ''جھالرہ'' کے مقابل وسیع و عریض میدان میں لوگوں نے پڑاؤ ڈال لیا جہاں یہ مقابلہ ہونے والا تھا۔ گلی بازاروں میں اس مقابلے کے چرچے ہو رہے تھے۔ جے پال کی طاقت سے سب واقف تھے اور پھر اس کے ساتھ دیگر جادوگر بھی آنے والے تھے، لہٰذا بیشتر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ اس مقابلے میں جے پال کی فتح ہو گی اور مسلمان فقیر کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔

مقابلے سے ایک دن پہلے بانس' بلیاں اور تختے لگا کر ایک اونچا اسٹیج بنا دیا گیا جہاں راجا کو بیٹھنا تھا۔ رات ہی سے راجا کے سپاہیوں نے پورے علاقے کو گھیر لیا تاکہ مسلمان فرار

ہونے کی کوشش نہ کریں۔ راجا انہیں جے پال کے ذریعے میدان میں شکست دینا چاہتا تھا۔ سب کو دکھانا چاہتا تھا کہ دیکھ لو مسلمان کتنے بڑے جادوگر ہیں۔ اسے یقین تھا کہ جے پال یہ کام کر دکھائے گا۔

ڈھول اور نفیریوں کی آواز سے پورا میدان گونج رہا تھا۔ لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عجیب منظر تھا۔ ایک طرف میدان تھا جس میں انسانوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ دوسری جانب ایک مسجد کی چند دیواریں اور کچھ کچے پکے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اچانک اعلان ہوا پرتھوی راج کی سواری یہ مقابلے دیکھنے کے لیے میدان کی طرف آ رہی تھی۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے بلند کئے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پرتھوی راج ارا کین سلطنت کے ساتھ اس اونچے ''اسٹیج'' کی طرف بڑھ گیا۔ اس اونچی جگہ پہنچ کر اس نے تعمیر ہوتی ہوئی مسجد کی طرف نفرت سے دیکھا اور نخوت سے گردن بلند کر کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں جے پال اپنے شاگردوں کے ساتھ آ گیا۔ پورا میدان ایک مرتبہ ''جے پال کی جے'' کے نعروں سے گونج گیا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ اور آپ کے ساتھی دور سے ان تیاریوں کو دیکھ رہے تھے اور ہندوؤں کی جہالت پر مسکرا رہے تھے۔

''مسلمان تو ابھی تک میدان میں اترے نہیں' کہاں ہے وہ مسلمان فقیر' ہم کس سے مقابلہ کریں گے ؟'' جے پال نے راجا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مقابلے پر آنے کی ہمت ہی کہاں ہوگی' کہیں دبکے بیٹھے ہوں گے۔'' ارا کین سلطنت میں سے کسی نے کہا اور کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔

''انہیں خبر تو کر دی گئی تھی' پھر وہ آئے کیوں نہیں، کہیں بھاگ تو نہیں گئے ؟''

''اب تو انہیں بلانے کے لیے بھی جادو کرنا پڑے گا۔''

میدان میں موجود لوگوں کی بے چینی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جے پال کے غرور و تکبر میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے خوف کی وجہ سے مسلمان فقیر میدان میں آنے سے گریز کر رہا ہے۔

''حضور! ہمیں بھی میدان میں چل کر بیٹھنا چاہئے ورنہ یہ لوگ کیا کہیں گے کہ اسلام کو مقابل آنے کی ہمت نہیں پڑی۔'' رام دیو نے کہا جو اب محمد عبداللہ ہو چکے تھے۔

''اچھا! یہ بات ہے تو اسلام کی سربلندی کے لیے ہم بھی وہاں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ویسے ہمیں جادو وغیرہ تو آتا نہیں ہے۔'' آپ نے مسکرا کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

آپ کا اشارہ پاتے ہی مریدین نے کھلے میدان میں صفیں بچھا دیں۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما ہو گئے۔ ہجوم میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ جے پال اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا حضرت خواجہ معین الدینؒ کے پاس پہنچ گیا۔ مجمع سانسیں روکے کھڑا تھا کہ نہ جانے کیا ظہور میں آئے۔

''بابا جی! پہلے میں اپنا جادو دکھاؤں یا آپ پہل کریں گے ؟'' جے پال نے آپ سے پوچھا۔

''تمہیں جو کرنا ہے کرو۔'' آپ نے فرمایا اور ذکر میں مشغول ہو گئے۔

جے پال نے یہ جواب سنا اور اپنی مالا پر کوئی منتر پڑھنے لگا۔ اچانک بے شمار سانپ نمودار ہوئے اور پھنکارتے ہوئے حضرت خواجہ بزرگ کی طرف بڑھنے لگے۔ لوگ خوف زدہ ہو گئے کہ اب یہ سانپ فقیر بابا اور ان کے ساتھیوں کو یقیناً ڈس لیں گے۔ یہ مقابلہ تو پہلے جادو ہی میں ختم ہو جائے گا۔ ہر آنکھ اس لمحے کی منتظر تھی جب سانپ حضرت خواجہ اور آپ کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوں گے۔ لیکن یہ کیا؟ یہ سانپ جیسے ہی ان صفوں کے قریب پہنچے جہاں حضرت اور ان کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے، ایک ایک کر کے مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، ایک سانپ بھی اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

''یہ کیا! تمہارے تو تمام سانپ مٹی کا ڈھیر بن گئے؟'' پرتھوی راج نے جے پال سے کہا۔

''مہاراج! یہ تو میں نے ہلکا سا جادو دکھایا تھا۔ میرے ترکش میں ابھی کئی تیر باقی ہیں' آپ دیکھتے جایئے ہوتا کیا ہے۔''

جے پال دوسرے کرتب کے لیے جنتر منتر پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ اس جادو کا اثر یہ ہوا کہ آسمان سے آگ کے شعلے برسنا شروع ہو گئے لیکن ہر شعلہ حضرت خواجہ بزرگ کے ارد گرد گر رہا تھا۔ اس آگ سے آپ اور آپ کے ساتھیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ پھر یہ شعلے برسنا بند ہو گئے۔

لوگوں کی خوشی مایوسی میں بدلنے لگی تھی۔ راجا بھی جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ جے پال کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

''مہاراج! آپ گھبرائیں نہیں بس دیکھتے جائیں۔''

جے پال نے کہا اور پھر اپنے تھیلے سے ہرن کی کھال نکالی اور اسے زمین پر بچھا کر اس پر بیٹھ گیا اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اچانک وہ کھال جے پال کو لے کر فضا میں بلند ہوگئی اور وہ ہوا میں پرواز کرنے لگا۔ کوئی شیطانی طاقت اسے ہوا میں اِدھر اُدھر لیے پھر رہی تھی، لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ''مسلمان فقیر سے کہو وہ بھی اسی طرح ہوا میں اڑ کر دکھائے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ وہ مقابلہ ہار گیا۔'' پرتھوی راج اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ معین الدینؒ کے پاس اس جادو کا توڑ نہیں ہوگا۔

مریدوں کی آنکھیں' حضرت کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں کیا ظہور میں آتا ہے۔ آپ کی کھڑاویں قریب پڑی ہوئی تھیں۔ آپ نے ان کھڑاوؤں (جوتے یا چپل جو لکڑی سے بنائے جاتے تھے) کو حکم دیا ''جاؤ اور جے پال کو نیچے لاؤ''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی لاج رکھی۔ کھڑاویں فضا میں بلند ہوئیں اور جے پال کے سر پر زور زور سے برسنے لگیں۔ وہ بلبلانے لگا ہاتھ سے مالا گر پڑی۔ وہ چیختا چلاتا زمین پر اترا اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ بے بسی سے اپنے چیلوں کی طرف دیکھا جو اس کے ارد گرد جمع ہوگئے تھے۔

''ہندوستان میں مجھ سے بڑا جادوگر اور کوئی نہیں۔ کوئی میرے جادو کو توڑ نہیں سکتا تھا۔ حضرت معین الدینؒ جادوگر نہیں روحانی قوت کے مالک ہیں۔ انجام بخیر چاہتے ہو تو مسلمان ہوجاؤ۔''

حق اور ناحق کو لوگوں نے بہ چشم خود ملاحظہ کر لیا تھا۔ جے پال اور اس کے ساتھی کیا اسلام لائے کہ اور بہت سے لوگ بھی اسی وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔

پرتھوی راج نے یہ سوچ کر مقابلہ منعقد کرایا تھا کہ اس مقابلے میں آپ کو شکست ہوگی تو لوگ آپ کی طرف سے بدظن ہوجائیں گے لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ آپ پر لوگوں کا ایمان مزید پختہ ہوگیا۔

تعمیر کا کام ہزار دقتوں کے باوجود جاری تھا۔ اب آپ کے اتنے معتقد ہوگئے تھے کہ مالی امداد کی کمی نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مطبخ خانہ' جماعت خانہ' حجرہ اور مسجد اولیا تیار ہوگئی۔ آستانۂ مبارک مرجع خلائق بن گیا۔ ہر وقت رونق رہنے لگی۔ لوگ اپنی مرادیں لے کر حاضر ہوتے اور جھولیاں بھر کر لے جاتے۔ آپ ہندو' مسلمان کی تفریق کے بغیر ہر ایک سے کشادہ دلی سے ملتے، لوگوں کے حق میں دعا کرتے' ذکر و فکر کی محفلیں سجاتے۔ اپنے پرائے سب فیض پاتے۔

مسجد اولیا میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ نے اجمیر میں وارد ہونے کے بعد جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی روز بہ روز فزوں تر ہوتی جارہی تھی۔ اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔

کرامات کا ظہور اور خوارق عادات کا اظہار ولایت کی دلیل نہیں اور نہ ہی اولیا اللہ بے جا اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہاں جب اسلام کی سربلندی کا سوال ہو تو اللہ تعالیٰ ان میں ایسی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ جو وہ کہتے ہیں وہی ہوجاتا ہے۔ اناساگر کے پانی کے خشک ہونے میں بھی حقیقت کارفرما تھی۔ جے پال کے جادو کا توڑ اسی حقیقت کا اظہار تھا۔ ان کرامات ہی نے دشمنوں کی قلبِ ماہیت کی اور کفرستان میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ کچھ لوگ اسے محض قصے کہانیاں سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ بزرگ جیسی پاکیزہ زندگیاں گزارتے ہیں اس کے سامنے یہ کرامات کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

☆☆☆

راجا پرتھوی راج سے شکست کھانے کے بعد سلطان شہاب الدین غوری' غزنیں میں مایوسی اور بے دلی کے دن گزار رہا تھا۔ رات دن اسی خیال میں غلطاں رہتا تھا کہ کس طرح اس شکست کا بدلہ لے۔ اسے اپنی ہمت پر بھروسا تھا لیکن امرا کی بے وفائیاں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھیں۔ اسے سرفروشوں کی جماعت چاہیے تھی۔ دور دور تک نگاہ دوڑاتا تھا۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

سردیوں کی ایک رات اس کی امیدوں کے شجر پر ثمر لے آئی۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تھا لیکن اضطراب تھا کہ آنکھ لگنے نہیں دیتا تھا۔ اس نے خیالوں ہی خیالوں میں کئی مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی اور پھر لوٹ آیا۔ بے یار و مددگار۔ زخموں سے چور' ہراساں اور پریشان۔ کیا میں اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب ہوسکوں گا؟ اس کے دل سے ایک درد بھرا سوال ابھرا۔ اور وہ ایک سرد آہ کھینچ کر خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آگئی۔

''اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کی سلطنت تمہیں بخشی۔ جلد اس طرف توجہ کرو اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر کے سزا دو۔''

ایک نورانی چہرہ بزرگ عالم خواب میں اسے بشارت دے رہے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اس خواب کو اپنے ذہن میں دہرایا۔ یہ میری محرومیوں کی آواز ہے یا واقعی

کوئی مجھے بشارت دے رہا تھا؟ ان بزرگ کا چہرہ اس کی آنکھوں میں آ گیا۔ روشن آنکھیں، متبسم ہونٹ کشادہ پیشانی، وہ چہرہ اس کے حافظے میں ابھی تک محفوظ تھا۔

اس نے اس خواب کو ذہن سے جھٹک کر سونا چاہا لیکن نیند نے بغاوت کر دی تھی۔

صبح ہوتے ہی اس نے غزنیں کے علما فضلا کو طلب کر لیا اور سب کے سامنے اپنا خواب بیان کر کے ان سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔

''مبارک ہو۔ خواب بہت مبارک ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی جا رہی ہے۔ آپ بے خوف و خطر ہندوستان پر حملہ کر دیں۔''

''میں کن ساتھیوں پر بھروسا کر کے اتنا بڑا قدم اٹھاؤں؟''

''بشارت آپ کو مل گئی ہے۔ آپ آغاز کریں کوئی نہ کوئی صورت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔''

''وہ نورانی بزرگ کون ہو سکتے ہیں۔''

''اللہ تعالیٰ خود خواب میں نہیں آتا۔ اپنے کسی نہ کسی بندے سے کام لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان بزرگ سے کبھی آپ کی ملاقات ہو بھی جائے۔'' علما نے جواب دیا۔

علما نے امید دلائی تو اس کی ہمت بندھی۔ اس نے تن دہی سے اسلامی لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔ اور غیب سے کوئی صورت پیدا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

جہاد کی سرگرمیوں کا چرچا ہوا تو مختلف سردار بھی سرگرم ہو گئے۔ ایک دن سردار معین الدین تولکی جو علاقہ تولک کی پہاڑیوں کے سرداروں کا سرغنہ تھا شہاب الدین غوری کے پاس اس خوش خبری کے ساتھ حاضر ہوا۔

''ایک لاکھ بیس ہزار مسلح سوار جذبۂ جہاد سے سرشار آپ کے حکم کے منتظر تیار بیٹھے ہیں۔'' غیب سے امداد ملنے کی پہلی نشانی ظاہر ہو چکی تھی۔ ایک لاکھ بیس ہزار سرفروشوں کا ظاہری سہارا مل چکا تھا۔ ابھی سردار معین الدین تولکی اس لشکر کے جانبازوں کی داستانیں سنا رہا تھا کہ چوبدار حاضر ہوا۔

''قنوج کے راجا جے چندر نے ہندوستان سے اپنا ایلچی بھیجا ہے۔ آپ سے ملنے کا خواستگار ہے۔ کہتا ہے کہ راجا کی جانب سے ایک ضروری پیغام آپ کے نام لے کر حاضر ہوا ہے۔''

''بھیج دو۔'' سلطان شہاب الدین نے کہا۔

ایلچی حاضر ہوا۔ آدابِ شاہی بجا لانے کے بعد راجا جے چندر کا رقعہ جو شہاب الدین غوری کے نام لکھا گیا تھا، پیش خدمت کیا۔ لکھا تھا۔

''شہاب الدین غوری! تم دہلی پر حملہ کرو۔ میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا اور پوری پوری مدد کروں گا۔ مزید برآں وہ تمام راجے جو راجا پرتھوی راج کے مخالف ہیں، وہ بھی تمہارے راستے میں نہیں آئیں گے۔''

''جے چندر کو ہم سے ایسے کیا محبت ہو گئی کہ وہ ہمیں ہندوستان پر حملے کرنے کی دعوت دے رہا ہے اور سدّراہ نہ ہونے کی عہد کر رہا ہے۔'' سلطان شہاب الدین نے ایلچی سے پوچھا۔

''آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔'' ایلچی نے عرض کیا ''راجا جے چندر اور پرتھوی راج کی آپس میں سخت مخالفت بلکہ عداوت ہے۔ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے چارہ جوئی کرتے رہتے ہیں۔ جے چندر نے آپ کی محبت میں نہیں بلکہ پرتھوی راج کو سبق پڑھانے کے لیے آپ کو دعوت دی ہے۔''

ایلچی کے لہجے سے صداقت کی بو آ رہی تھی۔ حقیقت نمایاں ہو گئی تھی۔ شہاب الدین کی تشفی بھی ہوئی اور خدا کے انعام پر تشکر کے آنسو بھی آنکھوں میں آئے۔ ایک دن میں دو دو خوش خبریاں سننے کو ملی تھیں۔ اس نے اسی وقت کاتب کو بلوایا اور پرچا لکھوایا۔

راجا جے چندر! انشاء اللہ ہم عنقریب حملہ آور ہوں گے اور راجا پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دیں گے۔''

ادھر راجا جے چندر کا ایلچی ہندوستان روانہ ہوا ادھر سلطان شہاب الدین اسلامی لشکر کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے غزنیں سے روانہ ہوا۔

منزلوں منزلوں گرداڑاتا، یہ لشکرِ اسلامی لاہور پہنچ گیا۔ کچھ دن آرام کرنے اور مکمل منصوبہ بندی کرنے کے بعد سلطان شہاب الدین نے اپنے ایلچی کو پرتھوی راج کے پاس روانہ کیا تاکہ اسے ہتھیار ڈالنے پر رضامند کیا جائے۔

راجا پرتھوی راج غیظ و غضب میں بھرا، دربار میں بیٹھا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ کا اجمیر میں ہی وجود اب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔

''بس بہت ہو چکا۔ میری پرجا پاپ، مجھ سے پھر جائے میں کل معین الدینؒ اور اس کے ساتھیوں کو اجمیر سے نکال دوں گا پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ سلطان شہاب الدین غوری کے ایلچی کے آنے کی خبر دربار میں پہنچی۔

اس کے لیے یہ خبر چونکا دینے والی تھی کہ شہاب الدین لاہور تک آپہنچا ہے۔

خواجہ معین الدینؒ کا قصہ ایک طرف رہ گیا۔ وہ اب ایلچی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے اراکین مبہوت بیٹھے تھے' دربار میں سکوت کا عالم طاری تھی۔ ایلچی اندر آیا اور خط پیش کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔

''چندا بھاٹ! اس خط کو بلند آواز سے پڑھو۔'' پرتھوی راج نے کہا اور چندا بھاٹ نے خط پڑھنا شروع کیا۔

''پرتھوی راج! خون خرابے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہتر ہے بھٹنڈہ کے قلعے سے دستبردار ہو کر اطاعت کر لو ورنہ نتیجہ ظاہر ہے' گھمسان کا رن پڑے گا' پھر جو بھی نتیجہ ہو۔''

پرتھوی راج نے حقارت سے مسلمانوں کے ایلچی کی طرف دیکھا۔ گردن غرور سے اکڑ گئی۔ کاتب کو بلوایا اور خط لکھوانا شروع کیا۔

''شہاب الدین محمد غوری! کیا تم نے ماضی کی شکست سے کوئی سبق نہیں سیکھا؟ ہماری بے شمار فوج کی تیاری کا تمہیں اندازہ نہیں' تمام راجا میرے ساتھ ہیں۔ اگر تمہیں خود پر رحم نہیں آتا تو اپنی فوج پر رحم کرو اور پشیمان ہو کر واپس لوٹ جاؤ ورنہ تیار رہو میرے ہاتھی تمہاری فوج کو کچلنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔''

جنگ کی تیاری اوّلیت رکھتی تھی۔ وہ خواجہ معین الدینؒ کو نکال کر اس وقت کسی اندرونی بغاوت کو پنپنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا' لہٰذا اس معاملہ میں اس کے عزائم ایک مرتبہ پھر سرد خانے میں رہ گئے۔

مسلمانوں کے ایلچی کے واپس ہوتے ہی اس نے تمام راجاؤں کی طرف قاصد دوڑا دیے۔ انہیں مذہب اور ہندوستان کے نام پر غیرت دلا کر امداد کا طالب ہوا۔

مذہب اور ہندوستان کا سوال درمیان میں تھا۔ راجاؤں کے خطوط آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ اس میں راجا جے چندر اور اس کے چند ہم خیال راجے شامل نہیں تھے۔ تین لاکھ کا عظیم لشکر تین ہزار مست ہاتھیوں کے ساتھ راجا پرتھوی راج کے ساتھ تھا جبکہ مسلمان صرف ایک لاکھ بیس ہزار تھے۔ دونوں فوجوں نے دریائے سرسوتی کے پار مورچے لگائے۔ ایک کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا دوسرے کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا۔

جنگ کے آغاز سے قبل سلطان شہاب الدین نے اپنے فوجیوں سے مخاطب ہو کر نہایت پُرجوش تقریر کی۔ اس تقریر نے دلوں میں آگ لگا دی۔ مسلمان فوجی تقریر کے الفاظ ختم ہونے سے پہلے ہی لڑنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ ان کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے سلطان نے فوج کا پہلا حصہ آگے کیا۔

پرتھوی راج کے راجپوت سپاہیوں نے بھی تلوار پر ہاتھ رکھ کر مر مٹنے کی قسم کھائی تھی۔ دونوں فوجیں ٹکرائیں تو جیسے دو پہاڑ ٹکرا گئے۔ کچھ دیر بعد شہاب الدین نے دوسرے تازہ دم حصے کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ یہ دستہ ابھی تھکا نہیں تھا کہ فوج کا تیسرا حصہ آگے بڑھا۔ اور پھر چوتھا حصہ آگیا۔

پرتھوی راج اپنی تمام فوج سامنے لے آیا تھا جبکہ سلطان نے یہ ہوشیاری کی تھی کہ وقفے وقفے سے تازہ دم فوج سامنے لا رہا تھا۔ پرتھوی راج کی فوج کے قدم جلد ہی اکھڑ گئے۔ راجا کے مست ہاتھیوں نے اپنے ہی لشکر کو کچل کر رکھ دیا۔ جان بچانے کے لیے جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ راجا پرتھوی راج دریا کے کنارے گرفتار کر لیا گیا۔

اب سلطان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ راجا جے چندر سے اس کی پہلے ہی ساز باز ہو چکی تھی، وہ فتح کے شادیانے بجاتا ہوا دہلی پہنچ گیا۔ تیزی سے دہلی کا انتظام سنبھالا۔ اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود راجا جے چندر' والیٔ قنوج اور دوسرے راجاؤں کی معیت میں اجمیر کی طرف چل دیا۔

سلطان نے اجمیر میں قدم رکھا تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ اچانک اس نے اذان کی آواز سنی تو حیران رہ گیا۔ اس کفرستان میں اذان کی آواز کیسی؟

''یہ اذان کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟'' اس نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی سے دریافت کیا۔

''کچھ عرصے سے یہاں کچھ درویش قیام پذیر ہیں۔ انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کی ہے۔''

''کس طرف ہے وہ مسجد؟''

''جہاں آپ کھڑے ہیں اس سے کچھ ہی فاصلے پر۔''

''چلو' پھر نماز مسجد ہی میں پڑھیں گے۔''

اجمیر کے مندروں کی اداس دیواریں اس قافلے کو لبِ جھالرہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ دور سے مسجد کے مینار ہاتھ بلند کیے نظر آئے پھر کچھ اور عمارتوں پر اس کی نظر پڑی۔ یہ مطبخ خانے اور جماعت خانے وغیرہ کی عمارتیں تھیں۔

جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ شہاب الدین بھی شامل ہو گیا۔ قرأت کی دل کش آواز نے اس کے دل میں لذت کے بھنور ڈال دیے۔ لہجہ بتا رہا تھا کہ قرأت کرنے والا مقامی نہیں ہے۔ ایسی دل سوز آواز اس نے پہلے نہیں سنی تھی۔

نماز ختم ہوئی تو وہ امام صاحب سے ملنے اور انہیں دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ کیسا شخص ہوگا جس نے کفرستان میں مسجد تعمیر کرنے کی جرأت کی ہے۔ وہ ملاقات کی غرض سے آگے بڑھا۔ حیرت انگیز خوشی نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ وہ جس ہستی سے ملاقات کر رہا تھا۔ وہی بزرگ تھے جنہوں نے خواب میں آکر ہندوستان کی فتح کی بشارت دی تھی۔ یہ شخصیت غریب نواز حضرت معین الدین سنجری اجمیری کی تھی۔

شہاب الدین مصافحے کے لیے آگے بڑھا تھا لیکن چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ آپ کے قدموں پر گر پڑا۔ آنسو بہہ رہے تھے، پورا بدن فرطِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔

''یا خواجہ! اپنی مریدی کا اس ناچیز کو شرف بخشیں۔''

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے شفقت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے حجرے میں لے کر آئے۔ شربت وغیرہ سے تواضع کے بعد آپ نے اسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کیا۔ یہاں سے اس نے پرتھوی راج کے محل کا رخ کیا۔ پرتھوی راج گرفتار کرنے کے بعد پہلے ہی قتل کیا جا چکا تھا۔ اس کا بیٹا ''کولا'' گرفتار تھا۔ سلطان شہاب الدین نے حکمت کے تحت اجمیر میں اپنا نائب مقرر کرنے کے بجائے پرتھوی راج کے بیٹے ''کولا'' کو اجمیر کا حاکم مقرر کر دیا۔ حکمت یہ تھی کہ اگرچہ اجمیر میں اسلام کی رونق حضرت خواجہ کی وجہ سے روز افزوں ہو رہی تھی لیکن ارد گرد کفر کا غلبہ تھا۔ ان علاقوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ انہی کا ہم قوم یہاں کا حاکم ہو۔

سلطان شہاب الدین کو انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کچھ عرصہ اجمیر میں قیام کرنا پڑا۔ اس تمام عرصے میں وہ حضرت معین الدینؒ کی خدمتِ عالیہ میں برابر حاضر ہوتا اور فیوض و برکات سمیٹتا رہا۔ دہلی کی طرف سے وہ پہلے ہی مطمئن ہو چکا تھا۔ اس کا غلام قطب الدین ایبک نہایت ذمے داری سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اور ادھر ادھر اٹھنے والی بغاوتوں کو بڑی کامیابی سے کچل رہا تھا۔ جب وہ اجمیر کی طرف سے بھی مطمئن ہوگیا تو اس نے خواجہ کی دعائیں لیں اور خراسان کی طرف لوٹ گیا۔

وقت کچھ دیر کے لیے تھم سا گیا تھا۔ امن و امان نے زنجیر ہلائی تو موسم ہی دوسرا تھا۔ دہلی میں قطب الدین ایبک کی حکمرانی تھی اور حضرت بختیار اوشی دینِ اسلام کی شمع روشن کر رہے تھے، اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدینؒ مقیم تھے۔ مقیم تو وہ کئی سال سے تھے لیکن مخالفتوں کی آندھیوں کے درمیان جھلملا رہے تھے۔ آپ کی دعاؤں سے شہاب الدین کو فتح حاصل ہوئی۔ راجا جو آپ کا سب سے بڑا مخالف تھا واصل جہنم ہوا۔ اب کوئی دنیاوی طاقت ایسی نہیں تھی جو آپ کی راہ میں رکاوٹ بنتی۔ پرتھوی راج کا بیٹا ''کولا'' اجمیر کا حاکم تھا، جو ارادے کے باوجود آپ کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ اب حجرۂ مبارک میں ذکر و فکر کی محفلیں آزادانہ آراستہ ہونے لگیں۔ علم و فیاضی کے دریا بہنے لگے۔ اجمیر اور اس کے مضافات اور قریبی شہروں میں بسنے والے لوگ دعا و برکت کے لیے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہونے لگے۔ اپنی مشکلات کے حل کی امیدیں لیے آنے لگے۔ سائل، حاجت مند محتاج، یتیم، بیوائیں درِ خواجہ پر حاضر ہوتے۔ آپ سب کی دستگیری فرماتے۔ بھوکوں کو کھانا مل جاتا۔ ظالم کو ظلم سے نجات ملتی۔ ہر ایک سے اس طرح گفتگو کرتے کہ وہ یہی سمجھتا جیسے وہ سب سے زیادہ اسی کو چاہتے ہیں۔ اس در سے جسے نوازا جاتا وہ آپ کو غریب نواز کہہ کر پکارنے لگتا۔

اپنے بعض مریدین و خلفا کو آپ نے تبلیغ حق پر متعین کر رکھا تھا جو اجمیر کے قرب و جوار میں جا کر اسلام کی حقانیت واضح کرتے رہتے تھے۔ اس انداز و طریق تبلیغ نے کفار و مشرکین کے اذہان و قلوب میں انقلاب عظیم برپا کر دیا اور نورِ اسلام اپنی تابانیوں اور رحمتوں کے ساتھ پھیلنے لگا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے مقصد کے حصول کے لیے شبانہ روز مصروف تھے۔ راتیں عبادتِ الٰہی میں بسر ہوتیں، دن تبلیغ اور آستانے پر آنے والوں کی دل جوئی میں گزر جاتے۔ فراغت کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں تھا۔ کئی کئی دن بعد نیند غالب آجاتی تو کچھ دیر کے لیے فرش پر دراز ہو جاتے۔

ایک رات سونے کے لیے زمین کو فرش بنایا تو زمین عرش معلی بن گئی۔ حضور اکرم ﷺ خواب میں تشریف لے آئے اور بڑی شفقت سے فرمایا۔

''معین الدینؒ! تم ہمارے دین کے معین ہو اور میری سنتوں میں سے ایک کے تارک ہو۔''

''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ کون سی سنت؟''

''تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔'' ارشاد ہوا۔

آنکھ کھلی اور خواب یاد آیا تو خوف سے بدن لرزنے لگا۔ دن رات کی مصروفیت میں شادی کا خیال ہی نہیں آیا۔ کہیں اس کوتاہی سے میرے آقا و مولاؐ ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ چہرہ ہلدی بن گیا۔ نیند آنکھوں سے اڑ گئی۔

آقا کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اب آپ اس فکر میں گھلنے لگے کہ یہ بات کس سے کہیں، حکم کی بجا آوری کیسے ہو۔ شادی کہاں کریں؟

آپ اس فکر میں غلطاں تھے کہ ایک روز آپ کا ایک ایک مرید ملک خطاب جو قطب الدین کے ایک قلعے کا حاکم تھا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک کنیز آپ کی خدمت میں پیش کی۔

"حضور! قطب الدین ایبک نے مجھے ایک راجا کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہمیں فتح حاصل ہوئی۔ مال غنیمت میں راجا کی بیٹی ہمارے ہاتھ لگی جسے میں آپ کی خدمت کے لیے لے کر آیا ہوں۔"

آپ نے صبر و سکون سے ملک خطاب کا پورا بیان سنا اور پھر اس لڑکی سے مخاطب ہو کر اسلام کی حقانیت سے اسے آشنا کیا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

"یا شیخ! میں تو کب سے اس دن کے لیے ترس رہی تھی۔ جب آپ کا اور جے پال جادوگر کا مقابلہ ہوا تھا، میں بھی اپنے پتاجی کے ساتھ یہ مقابلہ دیکھنے آئی تھی۔ اسی دن مجھے یقین آ گیا تھا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے لیکن اس وقت میں مجبور تھی۔ چپکے چپکے آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔ تقدیر نے آج مجھے آپ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا ہے۔ آپ مجھے کلمہ پڑھائیں۔"

آپ نے اسے کلمہ پڑھایا۔ "آج سے تمہارا نام امتہ اللہ ہے، میری طرف سے تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو۔" آپ کو اچانک اپنا خواب یاد آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس خواب کی عملی صورت پیدا فرما دی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اب یہ سنت بھی پوری ہو جائے گی، آپ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ آپ نے اسے نکاح کی دعوت دی جو اس لڑکی نے بہ خوشی قبول کر لی اور آپ نے حضرت امتہ اللہ کو اپنے عقد میں قبول فرما لیا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک تقریباً چونسٹھ سال ہو چکی تھی۔

موسم بدلتے رہے۔ شہاب الدین غوری اپنے نامزد حاکم قطب الدین ایبک سے بے حد مطمئن تھا، اتنا مطمئن کہ دوبارہ ہندوستان آنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اب سلطان قطب الدین ایبک خود مختار تھا اور سلطنت کی توسیع میں مشغول تھا۔

اجمیر میں پرتھوی راج کا بیٹا "کولا" حکمران تھا۔ وہ مسلمانوں کی طاقت کے رعب میں خاموش تھا لیکن اندرونِ خانہ مسلمانوں کے خلاف سرگرمِ عمل رہتا تھا۔ اس کی یہ حرکتیں جب زیادہ بڑھ گئیں تو قطب الدین ایبک نے اسے حاکمیت سے دستبردار کر دیا۔ اور اس کی جگہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے ایک مرید میر سید حسین مشہدی کو حاکم اجمیر مقرر کر دیا۔

اس تبدیلی کو اردگرد کے کفار نے دل سے قبول نہیں کیا لیکن قطب الدین ایبک کی طاقت کے سامنے ہر سازش دم توڑ دیتی تھی۔

سلطان قطب الدین ایبک ایک روز چوگان کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گرا اور سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ اس اچانک حادثے نے کفار کے حوصلے بڑھا دیے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں افراتفری پھیل گئی۔ جگہ جگہ فتنے سر اٹھانے لگے سید مشہدی اسی ایک فتنے کی نذر ہو کر شہید ہو گئے۔

سلطان قطب الدین ایبک کے بعد اراکین سلطنت نے سلطان مرحوم کے غلام شمس الدین التمش کو اس کا جانشین بنایا۔ 585ھ میں حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ایک لڑکے کو دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا جب تک دہلی کا بادشاہ نہ ہو گا اللہ تعالیٰ اسے دنیا سے نہیں اٹھائے گا۔ بائیس سال بعد آپ کا فرمان سچ ثابت ہوا کیونکہ شمس الدین التمش وہی لڑکا تھا۔

التمش تخت پر بیٹھا تو ہر طرف کفر و شرک نے سر اٹھایا ہوا تھا۔ اس لیے اس کا زیادہ تر وقت بغاوتوں کو کچلنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے باوجود بزرگوں سے اس کی عقیدت کم نہیں ہوئی تھی خصوصاً حضرت خواجہ قطب الدینؒ بختیار اوشی کا بہت ارادت مند تھا اور ان کے حوالے سے حضرت خواجہ معین الدینؒ کا نیاز مند تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ رشد و ہدایت کے چراغ روشن ہوتے گئے۔ ان چراغوں کی روشنی دور و نزدیک پھیل رہی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ کی مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہندوستان بھر سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیوض و برکات سے اپنا دامن بھر کر لے جاتے۔

سید حسین مشہدیؒ کی شہادت کے بعد ان کے چچا حضرت سید وجیہہ الدین مشہدی اجمیر کے داروغہ مقرر ہوئے تھے۔ عابد و زاہد، شب زندہ دار تھے۔ ان کی دختر بی بی عصمت اللہ بھی نہایت عبادت گزار تھیں۔ والد گرامی کو ان کی شادی کی فکر ہونے لگی تھی لیکن کوئی نیک شخص نظر نہیں آتا تھا جس سے ان کا عقد کیا جاتا۔ ایک شب وہ استراحت فرما رہے تھے کہ حضرت امام جعفر صادق کو خواب میں دیکھا۔

"کیوں پریشان ہو؟"

"بی بی عصمت کے لیے کوئی رشتہ نہیں مل رہا ہے۔ بس یہی پریشانی ہے۔"

''تمہارے لیے ایک مبارک حکم ہے۔''
''حضور کیسا حکم؟''
''حضور اکرمؐ کا حکم ہے کہ وجیہہ الدین سے کہو اپنی بیٹی کی شادی خواجہ معین الدین سنجری سے کر دو۔''

حضرت سید وجیہہ الدین کی آنکھ کھلی تو فکر و پریشانی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پہلی فرصت میں حضرت معین الدینؒ کے آستانۂ عالیہ پہنچ گئے۔ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا' عرض کیا اور جواب کے انتظار میں خاموش بیٹھ گئے۔

حضرت معین الدینؒ کی عمر اس وقت 81 سال کی ہو چکی تھی۔ یہ عمر شادی کی نہیں ہوتی لیکن حضور اکرمؐ کا حکم تھا۔ اگر انکار کرتے تو آنحضرتؐ کے حکم سے سرتابی ہوتی۔ اس سرتابی کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے کچھ دیر سوچا اور پھر اثبات میں جواب دیا۔

''وجیہہ الدین! اگرچہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں' اب یہ عمر شادی کی نہیں لیکن نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔'' دوسرے ہی دن بی بی عصمت اللہ آپ کے عقد میں آ گئیں۔ یہ آپ کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹی اور دو بیٹے تولد ہوئے تھے جو آپ کی نگرانی اور والدہ کی تربیت کی چھاؤں میں پاکیزگی کا سفر طے کر رہے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کی زیست کا ایک ایک لمحہ دینِ اسلام کی روشنی پھیلانے میں گزر رہا تھا۔ عمر طبعی کے تمام قیمتی سال گزر چکے تھے۔ اب آپ چراغ سحری تھے۔ آپ نے مختلف خلفا کی صورت میں ایسے چراغ روشن کر دیے تھے جو مختلف مقامات پر اپنے کردار و اخلاق کے ذریعے قلوب و اذہان کو اسلام کی روشنی سے منور کر رہے تھے۔ وہ مطمئن ضرور تھے لیکن عمر گزرنے کا احساس بھی تھا۔ طائر وقت تیزی سے پرواز کر رہا تھا اور آپ کو اس سے پہلے کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ آپ کے بعد آپ کا کوئی جانشین آپ کے مشن کو پورا کر سکے۔ 633ھ کا سن تھا کہ آپ کو حضرت بختیار اوشی کی یاد آئی۔ خط و کتابت ہوتی ہی رہتی تھی۔ اس مرتبہ جو خط لکھا تو لکھ بھیجا کہ جیسے بیٹھے ہو اجمیر چلے آؤ۔ حضرت بختیار اوشی کئی مرتبہ اجمیر آنے کی ضد کر چکے تھے لیکن حضرت خواجہ معین الدینؒ ہمیشہ یہی کہتے رہے تھے کہ جب ان کی ضرورت ہو گی انہیں اجمیر بلا لیا جائے گا۔ شاید وہ وقت آ گیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ بار بار نظر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھ لیتے تھے جیسے کسی کا انتظار ہو۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ پھر خوشی سے چہرہ گلنار ہو گیا۔ حضرت قطب الدین بختیار اوشی مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ آپ ان کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ باقی حاضرین نے بھی آپ کی اتباع کی۔ خواجہ قطب الدین تیزی سے لپکے اور قدم بوسی کے لیے جھکنے لگے۔ آپ نے انہیں سینے سے لگایا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنی نشست تک آئے۔

''یا خواجہ! آپ کی کرم نوازی کی انتہا ہے کہ آپ نے شرف زیارت کا موقع فراہم کیا۔''

''قطب الدین! بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ننانوے سال کی عمر ہو گئی ہے کیا بھروسا سانس کب ساتھ چھوڑ دے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے' آپ کا سایہ مجھ جیسے حقیر کے لیے نعمت ہے۔''

''ربِ کریم تمہارے درجات بلند کرے۔'' حضرت خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر آپ اٹھ کر اپنے حجرے کی طرف چلے گئے۔

شبِ جمعہ اپنا دامن پھیلائے خیر و برکت کی طالب تھی۔ اجمیر کی جامع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ درویش، اہل صفا، مریدین' خلفا سب کو مدعو کیا گیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ حضرت قطب الدین بختیار اوشی کو ہمراہ لے کر مسجد میں داخل ہوئے تو ہر طرف نور کی بارش ہونے لگی۔ ایسی مجالس اکثر منعقد ہوتی تھیں لیکن آج تو جیسے فرشتے بھی ساتھ چلے آئے تھے۔

آپ نے زبان حقیقت کو جنبش دی تو کلمات نے بھی موقع محل کا ساتھ دیا۔ گفتگو کیا اہلِ دل کے لیے اشارے تھے۔

''ملک الموت کے بغیر دنیا کی قیمت کچھ نہیں کیونکہ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔'' سب لوگ خاموش تھے۔ سب اہلِ دل تھے سب ان اشاروں کو سمجھ رہے تھے۔ آپ گفتگو کرتے ہوئے بڑی دور تک نکل گئے۔ جب بیان ختم ہوا تو آپ فرما رہے تھے۔

''ہمیں اس جگہ (اجمیر) اس لیے لایا گیا ہے کہ ہمارا مدفن یہاں ہو گا۔ ہم چند ہی روز میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائیں گے۔''

بات اشاروں سے وضاحت تک پہنچ گئی تھی۔ حاضرینِ مجلس تڑپ اٹھے۔ داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ ابھی پیاس بجھی نہیں تھی کہ چشمہ اپنا رخ بدل رہا تھا۔ یہ آنسو اس وقت سسکیوں میں بدل گئے جب آپ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا' سندِ خلافت لکھو۔

''دہلی کی خدمت ہم نے قطب الدین کو دی ہوئی ہے۔اس کو تحریر میں بھی لانا چاہتے ہیں۔''
سندِ خلافت تحریر کرائی اور پھر اس پر اپنے دستخط ثبت فرما دیے۔

''قطب الدین! سندِ خلافت لے لو۔ بیعت خلافت تم سے بغداد ہی میں لے لی تھی۔'' آپ نے ارشاد فرمایا اور پھر حضرت قطب الدین بختیار اوشی کو اپنے قریب بلایا۔ اپنی دستار اور کلاہ آپ کے سر پر رکھی۔ قرآن شریف' مصلی اور لکڑی کی پاپوش جو بغداد سے چلتے وقت حضرت عثمان ہرونیؒ نے آپ کو عطا فرمائی تھی آپ کے حوالے کی۔

''قطب الدین! یہ چیزیں حضور اکرمؐ سے ہمارے خواجگانِ چشت کو بطور امانت ملی ہیں۔ جس طرح یہ امانت مجھ تک پہنچی اور میں نے تمہیں دی تم آگے پہنچا دینا۔ نیز اس کا حق ادا کرنا تاکہ قیامت کے دن ہم خواجگان چشت کے روبرو شرمندہ نہ ہوں۔''

آپ کا ارشاد اختتام کو پہنچا تو حضرت قطب الدین بختیار اوشی آداب بجالائے اور شکرانے کا دوگانہ ادا کیا۔ اسی اثنا میں حضرت خواجہ معین الدینؒ بھی نفل شکرانہ سے فارغ ہو چکے تھے۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ مسجد سے باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مسجد میں نور کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نور میں دعا کے اس نور کا مزید اضافہ ہو گیا۔

''قطب الدین! جا تجھے اللہ کو سونپا اور تجھے منزل گاہ تک عزت سے پہنچایا۔''

حضرت بختیار اوشی کے قلب اطہر میں یہ خیال گزرا کہ حضرت کی قدم بوسی کے بعد اب رخصت کی اجازت لینی چاہئے۔ روشن ضمیر مرشد پر فوراً منکشف ہو گیا کہ ان کے دل میں کیا خیال آیا ہے۔ فوراً نزدیک بلایا اور آخری نصیحت سے فیض یاب کیا۔

''غم نہ کرو اور مردہ نہ بنو۔''

حضرت قطب الدین نے دست بوسی کی۔ اجازت طلب کی اور دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اہل اجمیر اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہ ہوا گزرنے والی شب کیسے کیسے انعام لٹا کر رخصت ہو گئی۔ آنے والی صبح کیا تبدیلی لے کر آئی ہے۔ راز و نیاز کے کیسے کیسے فیصلے کھلے اور بند ہو گئے۔ آئندہ کیا ظہور میں آنے والا ہے۔

حضرت قطب الدین کے رخصت ہوتے ہی آپ نے خود کو حجرے میں بند کر لیا تھا۔ صرف نماز کی ادائیگی کے لیے باہر تشریف لاتے تھے۔ زیادہ تر خاموش رہتے تھے جیسے کسی خیال میں مست ہوں۔ اس تبدیلی کو سب محسوس کر رہے تھے لیکن پوچھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے آپ کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چہرے پر پھیلے ہوئے نور میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا نور کہ آپ کے مریدین اس نور کی ضیا پاشیوں میں کھوئے رہتے۔ یہ خیال

☆ قبرستان میں کھانا پینا اور ہنسنا نہیں چاہئے کیونکہ یہ مقام عبرت کا ہے' اور جو ایسا کرتے ہیں وہ سنگ دل اور منافق ہوتے ہیں۔

☆ اے غافل! سفرِ آخرت کا توشہ تیار کر جو تجھے درپیش ہے۔

☆ جس کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اس پر بلا نازل ہوتی ہے۔

☆ جو بزرگی کا دعویٰ کرتا ہے قید میں ہوتا ہے۔

☆ بندۂ مومن تین چیزوں کو دوست رکھتا ہے۔ اول فقرو فاقہ' دوم بیماری اور سوم موت۔

☆ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی رضا مرحمت فرما دے وہ بہشت کو کیا سمجھے۔

☆ محبت کے چار معنی ہیں۔

1۔ ذکرِ خدا میں دل و جان سے خوش رہنا۔

2۔ ذکرِ خدا کو بزرگ تر جاننا۔

3۔ اس کے ساتھ مشغول رہے' دوسروں کے ساتھ قطع تعلق کر لے۔

4۔ اپنے آپ پر روئے اور اس پر جس کو اس سے محبت ہے۔

☆ صاحبو! سورۃ فاتحہ تمام دردوں اور بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ جو بیماری کسی علاج سے درست نہ ہو وہ صبح کی نماز کے فرضوں اور سنتوں کے درمیان اکتالیس مرتبہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے سے دور ہو جاتی ہے۔

☆ نماز ایک امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے سپرد کی ہے۔ پس بندوں پر واجب ہے کہ امانت میں کسی قسم کی خیانت نہ کریں۔ جب انسان نماز ادا کرے تو رکوع و سجود کما حقہ' بجالائے اور ارکانِ نماز اچھی طرح ملحوظ رکھے۔

☆☆☆

ستاتا رہتا کہ نہ جانے اس کے بعد آپ کی زیارت نصیب ہو یا نہ ہو۔۔۔

پانچویں رجب 633ھ بمطابق 1237ء کو جب آپ عشا کی نماز سے فارغ ہوئے تو حاضرین سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ خلافِ معمولی حاضرین میں ہر ایک سے مصافحہ کیا اور حجرے کی طرف تشریف لے گئے۔ دروازے پر رک کر ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا اور خدام کو قریب بلایا۔

"کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔" آپ نے فرمایا اور حجرے کے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

خدام تو آپ کے دولتِ بخشش سے ایک پل کو جدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی حجرے کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اندر سے ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے عالم وجد میں کوئی رقص کر رہا ہوں۔ پیروں کی دھمک ایسی مسحور کن تھی کہ خدام بھی وجد میں آگئے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ مسحور کن آوازیں لحہ بہ لحہ بلند ہوتی جارہی تھیں پھر ان میں کمی آنے لگی اور جب رات نے آخری انگڑائی لی تو آوازیں بند ہوگئیں۔

"شاید حضرت نے تہجد کی نماز کے لیے نیت باندھ لی ہے۔ اسی لیے خاموشی طاری ہوگئی۔"

"آؤ ہم بھی اقتدا کرتے ہیں۔"

خدام بھی تہجد کے نوافل میں مشغول ہوگئے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو کان دروازے سے لگادیے۔ اندر مسلسل خاموشی تھی خدام نے خیال کیا کہ تہجد کے بعد حضرت آرام کی غرض سے لیٹ گئے ہیں۔

مؤذن نے صبح کی اذان بلند کی۔ آج مؤذن کی آواز میں وہ کیف تھا کہ اس سے پہلے بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے مسجد کھچا کھچ بھر گئی۔ حضرت کے دیدار کے اشتیاق میں لوگ کھنچے چلے آرہے تھے۔ نماز کا وقت تنگ ہوتا جارہا تھا' سب منتظر تھے کہ حضرت تشریف لائیں تاکہ امامت کریں۔ حکم تھا کہ کوئی حجرے کے اندر نہ آئے اس لیے سب حجرہ کھلنے کے منتظر تھے' آخر چند محرمان نے دروازے پر دستک دی پھر بھی دروازہ نہ کھلا تو بلند آواز سے آواز دی۔

"یا خواجہ باہر تشریف لائیں نماز کا وقت ہوگیا۔"

آواز کے جواب میں کوئی آواز نہ آئی تو چہروں پر تشویش کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ باہم فیصلہ کیا گیا کہ دروازہ توڑ دیا جائے۔ دروازہ ٹوٹا اور لوگ اندر گئے تو حضرت خواجہ چٹائی پر قبلہ رو دراز تھے۔ موت کا پل عبور کر کے دوست سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاچکے تھے۔

آپ کے وصال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق لبِ جھالرہ کی طرف چل پڑے۔ نمازِ جنازہ تیار ہوئی تو حدِ نظر تک سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے جو اللہ کے دوست کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ آپ کے صاحب زادے حضرت فخر الدینؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپ کے جسم اطہر کو حجرۂ خاص میں سپردِ خاک کردیا۔

☆☆☆

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے ایک شخص ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ آنے والا اجمیر سے آیا ہے تو مرشد کی یاد نے بے چین کردیا۔ مرشد کے شہر سے آنے والا عزت و احترام کا مستحق تھا۔ آپ اس کے احترام کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ نہایت توقیر سے اپنے قریب بٹھایا۔

مرشد کے شہر سے کوئی آیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا آپ اس سے مرشد کی خیریت دریافت نہ کرتے۔

"آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں ؟" نو وارد نے کہا۔

"کیا ہوگیا وہاں۔ کچھ بتاؤ تو۔"

"یا خواجہ! حضرت خواجہ بزرگ تو چالیس روز ہوئے اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے۔"

"یہ خبر مجھ سے چھپی رہی تو اس میں بھی میرے مرشد کی کوئی حکمت پوشیدہ ہوگی۔" آپ نے فرمایا اور پھر اس شخص سے آپ کے جنازے اور اہلِ اجمیر کی دلی کیفیات دریافت کرنے لگے۔ وہ شخص رخصت ہوا تو آپ پر غم واندوہ کی کیفیات کا غلبہ ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ یتیم ہوگئے ہوں' آنکھوں سے خود بخود آنسو گرے اور کپڑوں ہی جذب ہوگئے۔

"واہ خواجہ' خبر بھی نہ دی اور رخصت ہوگئے۔" آپ نے فرمایا اور عشا کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔

مسجد سے واپس آئے تو دل پر بوجھ سا تھا۔ مصلیٰ بچھایا اور وظائف میں مشغول ہوگئے۔ آج خلافِ معمول نیند سے آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں۔ آپ بہت دیر نیند سے لڑتے رہے۔ نیند کا غلبہ تھا کہ بڑھتا جارہا تھا۔ آخر ایسا جھونکا آیا کہ مصلے پر ہی لیٹ گئے ایسی نیند آئی جیسے کوئی تھپک تھپک کر سلا رہا ہو۔ آنکھ لگتے ہی آپ عالمِ خواب میں پہنچ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ زمین عرش پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے قدم بوس ہوکر کیفیتِ حال دریافت فرمائی۔

"اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے نوازا اور فرشتوں اور ساکنانِ عرش کے نزدیک جگہ عطا فرمائی اب میں

"یہیں رہتا ہوں۔"

اس جواب کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ دل ہلکا ہو چکا تھا صدمے کا نام تک نہیں تھا۔ اطمینان کی لہر تھی جو بدن میں دوڑ رہی تھی۔ نیند رخصت ہو چکی تھی۔ کسی نے صرف اتنی دیر تک سلایا تھا کہ آپ کی ملاقات حضرت خواجہ سے کرا دی جائے۔ آپ مصلے سے اٹھے، وضو کیا اور پھر وظائف میں مشغول ہو گئے۔

☆☆☆

اللہ بہت بڑا ہے اور اسے دوست بنانے والوں کی بڑائی میں بھی لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اولیا اللہ کا شمار اسی صفِ دوستاں میں ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ نظر رکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے کیا۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ کا مزار سادہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور ایک عرصے تک یہ عام قبور کی طرح رہا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کے احاطے میں وسعت آنے لگی۔ مختلف عمارات زمین کے سینے پر جنم لینے لگیں اور مزار پاک کی آرائش دیدنی ہو گئی۔ کئی عقیدت مند ہاتھ بلند ہوئے۔ کسی ہاتھ نے مزار اقدس پر عمارات تعمیر کرائیں۔ کسی نے سفید مرمریں گنبد بنوا دیا۔ کسی نے سونے کا کلس چڑھا دیا۔ اندرونی حصے میں سنہری لاجوردی کا کام ہو گیا۔ مزار شریف کے تعویذ میں یاقوتِ رمانی جڑ گیا۔ عظیم فاتح سلطان محمود خلجی زیارت کے لیے آیا تو پچاسی فٹ بلند دروازہ بنوا دیا اور روضے کے شمال میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔

اکبر اعظم کا دور آیا تو وہ بادشاہوں کے بادشاہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے مزار اقدس پر ننگے پاؤں چل کر آیا۔ دیکھا کہ خواجہ کا لنگر تقسیم ہو رہا ہے خواجہ کی زندگی میں ان کے پاس سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا اب بھی خواجہ کسی کو بھوکے پیٹ بھیجنے کو تیار نہیں۔ لنگر لوٹنے والے بھی ایسے کہ ایک پر ایک گرے جاتے ہیں مگر اس برکت سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔ خلقت اتنی ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے لوگوں کے کھانے کا انتظام کون کرتا ہو گا۔ خواجہ کی باتیں خواجہ جانیں۔ ان کے مہمان ہیں وہ خود انتظام کرتے ہوں گے۔ سوال تو یہ ہے کہ اتنے لوگوں کے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے بڑی دیر لگ جاتی ہو گی۔ سیکڑوں دیگیں چڑھتی ہوں گی۔ کیوں نا ایک ہی دیگ ہو۔ اکبر اعظم نے حکم دیا کہ ایک بہت بڑی دیگ تیار کی جائے جس میں ایک وقت میں سوا سو من چاول پک سکیں۔ پھر اس نے روضۂ مبارک اور بیگمی دالان کے مابین ایک صندل کا دروازہ بنوا کر نصب کرایا جو مشرقی دروازہ گلشن کہلاتا ہے۔

بے شک! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ پر چلنے والوں کو بلندی نصیب ہوتی ہے۔ بادشاہوں کے سر جھکتے ہیں اللہ ان کے دل میں ڈالتا ہے کہ میرے ولی کی شان و شوکت میں اضافہ کرو۔ میرے ولی کے پاس آنے والوں کی سہولت کے لیے سامان مہیا کرو۔

جب جہانگیر پیدا ہوا تو اکبر اعظم آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا اور اکبری مسجد تعمیر کرائی۔ لنگر خانے کے دالان میں لوہے کا کڑھایا بنوایا اور پھر چشم فلک نے یہ حیرت ناک نظارہ بھی دیکھا کہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے والا' پیالہ ہاتھ میں لیے لنگر لوٹنے والوں کی بھیڑ میں گم ہے۔ لوگوں کا ریلا آتا ہے اور اکبر کے ہاتھ سے پیالہ گر کر کرچیوں میں بدل جاتا ہے۔ خواجہ کی روح مسکراتی ہے اور کہتی ہے' اکبر! یہ درویشوں کا ڈیرا ہے یہاں بادشاہ اور فقیر میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تمہیں احساس ہو گیا ہو گا کہ تمہاری دنیاوی بادشاہت تمہارے معمولی پیالے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ کسی وقت بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو سکتی ہے۔

اکبر کے کانوں تک شاید یہ آواز نہیں پہنچی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ ان سعادتوں سے دور ہوتا چلا گیا اور گمراہی کے غار میں اتر گیا جہاں اس کا بنایا ہوا دینِ الٰہی تھا اور وہ تھا۔ چند روزہ بہار تھی پھر خزاں ہی خزاں۔

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشیں ہوا تو آپ کے در پر حاضر ہوا۔ بڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا کچھ مانگتا رہا۔ یہی مانگا ہوگا کہ میری شہنشاہیت باقی رہے۔

شاہ جہاں تخت پر بیٹھا تو اس نے اجمیر میں شاہ جہانی مسجد تعمیر کرائی۔ اس کی بیٹی نے بیگمی دالان تعمیر کرایا۔ ملکہ انگلستان نے دھمال خانے کے لیے چھتری بنوائی۔

حضرت خواجہ اپنے مزار میں آرام فرما ہیں اور فیضِ عام کا لنگر جاری کیے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شکم سیری کی نیت سے جاتا ہے تو اسے پیٹ بھر کے کھانا ملتا ہے، صبح شام لنگر جاری ہے شہر کے سارے مساکین، غربا، فقرا کھاتے ہیں اور کھانا پھر بھی بچا رہتا ہے۔ یہ ہے دستِ غیب۔ یہ ہے اللہ کے دوستوں کا تصرف۔

کسی کو اطمینان و سکون کی تلاش ہوتی ہے تو حاضر ہوتے ہی کوئی دستِ شفقت بڑھاتا ہے، اولیا اللہ کے مزارات پر ہر وقت رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ جو وہاں جاتا ہے اطمینانِ دلی سے فیض یاب ہوتا ہے۔

جب رجب المرجب کا چاند چڑھتا ہے اور خواجہ کے عرس کا دن آتا ہے تو بہاریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دنیا کے کونے کونے سے لوگ سوئے اجمیر چل پڑتے ہیں۔ ان میں عام لوگ بھی ہوتے ہیں، عقیدت مند بھی، اولیا اللہ بھی، امیر بھی غریب بھی ہندو بھی مسلمان بھی کیونکہ خواجہ سب کے خواجہ ہیں۔ اپنی حیات میں انہوں نے سب کو گلے سے لگایا تھا۔ وصال کے بعد بھی ان کا فیض سب کے لیے ہے۔ ان کے احسانات سب پر ہیں، انہوں نے بادشاہتیں تقسیم کی ہیں۔ سلطان شہاب الدین غوری کو آپ ہی نے بشارت دی کہ ہندوستان پر حملہ کرو، اور پھر اسے فتح سے ہمکنار کیا۔ التمش کی بادشاہت کے لیے پیش گوئی کی اور بالآخر وہ بادشاہ بن کر رہا۔

عرس کے شب و روز دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواجہ کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہوتا۔ کہیں خواجہ کی سیرت و اخلاق بیان کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ کہیں ان عبادات و ریاضات کا ذکر ہوتا ہے جو آپ نے قربِ الٰہی کے لیے کیں۔ کہیں آپ کے سیر و سفر پر گفتگو ہوتی ہے۔ کہیں تبلیغ اسلام کا تذکرہ ہے۔ کہیں آپ کے دورِ حیات کے ہندوؤں کی ریشہ دوانیاں موضوع بحث ہیں، کہیں جے پال سے مقابلے کی داستانیں سنائی جا رہی ہیں، کہیں "یا خواجہ!" کی دلدوز صدائیں ہیں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں نم ہیں، ہر طرف خواجہ ہی خواجہ ہے۔ اللہ نے ان کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔ جو نچھاور کر سکتا ہے نچھاور کر رہا ہے۔ جو لوٹ سکتا ہے لوٹ رہا ہے۔

ایک جانب چشتیوں کا خاص مشغلہ سماع اپنی بہاریں دکھا رہا ہے، زمین و آسمان وجد میں ہیں۔ روح کی کثافتیں دھل رہی ہیں۔ پرواز کی قوتیں بڑھ رہی ہیں۔ در و دیوار جھوم رہے ہیں۔

وصال کے بعد اولیا اللہ کی فیض رسائی میں ستر گنا اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کا فیض جاری و ساری ہے۔ مانگنے والا چاہیے سب کچھ ملتا ہے۔

حضرت خواجہ فرید گنج شکرؒ خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کے مریدِ خاص اور خلیفہ تھے نیز حضرت خواجہ معین الدینؒ کے بھی فیض یافتہ تھے۔ حضرت خواجہ کے وصال کے بعد آپ مزار پر معتکف تھے اور چلہ کاٹ رہے تھے۔ ایک رات روضے کے قریب نماز ادا کی اور وہیں بیٹھ کر تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف ہو گئے۔ تلاوت کے دوران ایک لفظ ترک ہو گیا۔ اسی اثنا میں انہوں نے ایک آواز سنی۔

"بابا فرید! ایک لفظ چھوڑ گئے ہو اسے پڑھو۔"

بابا فرید الدینؒ نے آیت پلٹائی اور جو لفظ چھوڑ گئے تھے اسے ادا کیا۔ پھر آواز آئی "قرآن پاک عمدہ پڑھتے ہو۔"

جب وہ تلاوتِ قرآن پاک فرما چکے تو حضرت خواجہ معین الدینؒ کی پائنتی پر کھڑے ہو کر فرمایا۔

"مجھے نہیں معلوم میں کس گروہ میں سے ہوں۔"

"جو شخص یہ نماز ادا کرتا ہے وہ بخشے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔" مزار کے اندر سے آواز آئی۔

لوگ آج بھی خواجۂ بزرگ کے مزار پر چلّے کاٹتے ہیں اور روحانی انعامات سے نوازے جاتے ہیں۔ آٹھ سو سال کے قریب ہو گئے یہ فیض جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ انشاء اللہ!

ماخذات

تاریخ مشائخ چشت۔ سیرت خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ۔ شاہ اجمیر مصنفہ نواز رومانی۔